ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

اسبابِ زوالِ امّت

سے
پرویز

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب —— اسباب زوال امت
مصنف —— علامہ غلام احمد پرویزؒ
ناشر —— طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
—— 25-B گلبرگ II لاہور 54660
طابع —— دوست ایسوسی ایٹس
—— الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور 54000
مطبع —— عالمین پریس
ایڈیشن —— اول 1952ء
—— دوم 1956ء
—— سوم 1962ء
—— ہفتم 1992ء دس ہزار
—— ہشتم 1993ء دس ہزار
—— نہم 1996ء دس ہزار
—— دہم 1997ء دس ہزار

طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) 25-بی گلبرگ نمبر2 لاہور 54660 (پاکستان)
فون: 876219-5753666-5764484 فیکس: 5764484
E-mail: tluislam@brain.net.pk
(http://www.toluislam.com)

ایڈیشن دہم کی طباعت کے لیے ہم
بزم طلوع اسلام کویت کے شکرگزار
ہیں۔ طلوع اسلام ٹرسٹ

طلوع اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ
آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۱۷۶ : ۷)

انہیں ان کی داستان سناؤ تاکہ یہ سوچیں (کہ ہمیں کیا ہوگیا)

داستان ---------

آدم جنّت میں تھا ' ابلیس نے اسے فریب دیا اور وہ جنّت سے نکالا گیا۔

یہ ہے ہماری داستان

ایک سوال ---------

اب سوال یہ ہے کہ جنّت سے نکلا ہوا آدم ' پھر سے جنّت میں کس طرح جاسکتا ہے ؟

اس کا جواب ---------

اس کا جواب بھی قرآن میں ہے اور وہی جواب آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آئے گا۔

شاید کہ خود را باز آفرینی !

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

ماہنامہ طلوع اسلام کی مارچ ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں ایک اہم سوال شائع ہوا تھا جس میں کہا یہ گیا تھا کہ:۔

> آج دنیا میں مسلمان جس جگہ بھی آباد ہیں، دوسری قوموں کے مقابلہ میں پستی اور ذلّت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

اس سوال کے جواب میں، مختلف اربابِ دانش و بینش کی طرف سے جوابات موصول ہوئے جو طلوع اسلام کی بعد کی اشاعتوں میں شائع ہوتے رہے۔ آخر میں، پرویز صاحب نے، اس موضوع پر ایک بھرپور مقالہ لکھا جو جنوری و فروری ۱۹۵۰ء کے صفحات میں پیش کیا گیا۔ یہ مقالہ اس قدر مقبول ہوا کہ اسے ۱۹۵۲ء میں دوبارہ طلوع اسلام میں شائع کرنا پڑا اور اس کے بعد اسے الگ کتابی شکل میں (مارچ ۱۹۵۲ء میں) شائع کیا گیا۔ اس کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۶۲ء میں۔ اس دوران میں مصنّف سے اس مقالہ کے بہت سے مقامات کی وضاحت چاہی گئی، بہت سے نئے سوالات پوچھے گئے، بہت سے مزید نکات سامنے لائے گئے۔ ان تمام امور کے پیشِ نظر، اس کتاب کے جدید ایڈیشن کی ضرورت بڑی شدّت سے محسوس کی گئی۔ چنانچہ اب اسے، مصنّف کی نظرِ ثانی کے

بعد‘ ایک جدید ترتیب اور ضروری ترمیمات اور حک و اضافہ کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ چونکہ ملّت کی بہبود کیلئے ضروری ہے کہ ان خیالات کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے‘ اس لئے اسے چیپ ایڈیشن کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔

یہ سوال کہ ہم اس قدر ذلیل و خوار اور پست و زبوں حال کیوں ہیں‘ بڑی ہی گہری توجہ کا محتاج اور غورو فکر کا مستحق ہے۔ ہمارے ہاں اول تو اس سوال کو (اجتماعی حیثیت سے) درخورِ اعتناء ہی نہیں سمجھا جاتا اور اگر اس کے متعلق کبھی گفتگو آ بھی جاتی ہے‘ تو اسے یا تو یونہی ٹال دیا جاتا ہے اور یا جذبات کے سیلاب میں بہا دیا جاتا ہے۔ مذہب پرست طبقہ کو اس سوال پر غصّہ آجاتا ہے اور وہ اسے یہ کہہ کر جھٹک دیتا ہے کہ اس قسم کی آوازیں مغرب زدہ‘ مادیت پرست‘ بے دین طبقہ کی طرف سے بلند کی جاتی ہیں‘ جن کے نزدیک‘ مقصدِ حیات بس اس دنیا کی خوشحالی اور آسائش ہے۔ یہ "روحانیت" کے قائل نہیں اور خدا اور رسولؐ سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔ خدا کے بندوں کی نگاہ آخرت کی زندگی پر ہوتی ہے اور وہی گھر انسان کا اصلی گھر ہے۔ یہ دنیا ایک سرائے ہے جس میں انسان محض سفر کی تکان اُتارنے کے لئے . . . . تھوڑے سے وقت کے لئے ٹھہرتا ہے۔ سرائے کا مسافر کبھی اس کی فکر نہیں کرتا کہ سرائے کی عمارت کس قسم کی بنی ہوئی ہے۔ اس نے اس میں ایک رات بسر کرکے دوسری صبح آگے چلا جانا ہوتا ہے۔ جب ہمارا . . . . تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ان مواعظ کو سنتا ہے تو چونکہ اس تعلیم کو اسلام کی تعلیم کہہ کر پیش کیا جاتا ہے‘ وہ اسلام کو

ترقی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھ کر اس سے برگشتہ ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس قسم کے مذہب کو (عیسائیت کی طرح) مسجد کی چار دیواری میں محدود کر دینا چاہیئے اور دنیاوی معاملات کو' اقوامِ یورپ کی طرح' اپنی عقل و فکر سے سرانجام دینا چاہیے۔ مذہب نے ہمیں تباہ کر دیا ہے اس لئے' اس سے جس قدر جلد پیچھا چھڑا لیا جائے' اتنا ہی اچھا ہے۔ یہ کش مکش دن بدن تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس کش مکش کے پیشِ نظر طلوعِ اسلام میں یہ سوال اٹھایا گیا تھا جس کا جواب مصنّف نے اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق' اس انداز سے دیا کہ اس سے مرض کی تشخیص بھی ہو گئی اور اس کا صحیح علاج بھی سامنے آگیا۔ تشخیص کے سلسلہ میں تفصیل کتنی ہی طول طویل کیوں نہ ہو' اجمالاً حقیقت اتنی ہی ہے کہ خدا کی طرف سے انسانوں کیلئے دین عطا ہوتا تھا جس سے ان کی یہ زندگی بھی کامیابی و کامرانی کی زندگی ہوتی تھی اور اس کے بعد کی زندگی بھی سرفرازی و سرخروئی کی زندگی۔ لیکن حضرات انبیائے کرامؑ کے نام لیوا بعد میں اس دین کو مذہب سے بدل ڈالتے تھے۔ جس سے لوگوں کو عجیب فریب میں رکھا جاتا تھا۔ یہی کچھ اسلام کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ لیکن ہمارے پاس خدا کی کتاب محفوظ ہے' اس لئے ہم اس مذہب کو دین سے بدل سکتے ہیں اور یہی اس مرض کا علاج ہے ؎

وہی دیرینہ بیماری' وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

ہماری استدعا ہے کہ آپ اس کتاب کو سرسری نگاہ سے نہ دیکھ

جائے بلکہ اس کا مطالعہ بڑے غور و تدبّر سے کیجئے اور اگر آپ اس سے متفق ہوں، تو اسے اپنے احباب تک بھی پہنچایئے تاکہ یہ فکر عام ہو جائے تو پھر قوم اگلا قدم اُٹھا سکنے کے قابل ہو سکے جس سے یہ اپنی موجودہ حالت سے نکل کر، نہ صرف زندہ قوموں کی صف میں کھڑے ہونے، بلکہ ان کی قیادت کے قابل ہو سکے۔

والسلام

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام،
۲۵ بی گلبرگ نمبر۲ لاہور نمبر۱۱
(فروری ۱۹۶۶ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسباب زوالِ اُمت

سوال زیرِ غور

آج دنیا کے اکثر حصوں میں مسلمانوں کی آبادیاں ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد کوئی چالیس کروڑ بتاتا ہے، کوئی پچاس ساٹھ کروڑ۔ تعداد کچھ بھی ہو، یہ ظاہر ہے کہ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک ان کی مسلسل آبادیاں چلی جاتی ہیں۔ اِدھر افریقہ میں بھی ان کی کافی تعداد ہے۔ یورپ کے کئی ملکوں میں مسلمان بستے ہیں۔ روس اور چین میں بھی ان کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ ان میں بیشتر حکومتیں ایسی ہیں جو بالکل آزاد ہیں۔ بعض نیم آزاد اور بعض نیم محکوم ہیں، بعض محکوم بھی ہیں۔ ان میں ایسے علاقے بھی ہیں جہاں خالص مسلمانوں کی آبادی ہے، بعض ایسے بھی ہیں جہاں مسلم اور غیر مسلم ملے جلے رہتے ہیں۔ یہ ہے مسلمانوں کی آبادی کی کیفیت۔ اب یہ دیکھئے کہ ان کی حالت کیا ہے؟ جو آزاد مملکتیں ہیں، وہ غیر مسلموں کی آزاد مملکتوں کے مقابلہ میں بہت کمزور اور ذلیل ہیں۔ افغانستان، ایران، حجاز، مصر، شام، انڈونیشیا وغیرہ حکومتیں، یورپ اور امریکہ کی غیر مسلم حکومتوں کے مقابلہ میں نہ صرف کمزور ہیں بلکہ ان کے رحم و کرم پر زندہ ہیں۔ وہ انہیں جس

حالت میں بھی رکھنا چاہیں' انہیں رہنا پڑتا ہے۔ ان میں سے ہر مملکت کسی نہ کسی غیر مسلم حکومت سے امداد لیتی ہے۔ انہیں کھانے کے لئے غلہ ان کے ہاں سے ملتا ہے' مشینری وہاں سے آتی ہے' ضروریاتِ زندگی کی اہم چیزیں ان سے لینی پڑتی ہیں' دوائیاں ان کے ہاں سے آتی ہیں' ہتھیار وہاں سے ملتے ہیں' حتیٰ کہ نقد روپیہ ان کے ہاں سے ملتا ہے۔ یہ سب کچھ غیر مسلم حکومتوں سے ملتا ہے' تب جا کر ان مسلمان حکومتوں کا گزارہ ہوتا ہے۔

اب آگے بڑھیے۔ روس' چین اور یورپ کے جن ملکوں میں مسلمان اور غیر مسلم ملے جلے رہتے ہیں' وہاں بھی مسلمان غیر مسلموں سے دبے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہاں اختیار و اقتدار سب غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے۔ وہاں کے جتنے بڑے بڑے لوگوں کا نام سننے میں آتا ہے' وہ سب غیر مسلم ہیں۔ کسی بڑے مسلمان کا نام تک سنائی نہیں دیتا۔ اگرچہ ان ملکوں میں حاکم اور رعایا کا تصوّر نہیں' وہاں ملک کے سب باشندے حکومت کے کاروبار میں یکساں شریک سمجھے جاتے ہیں' لیکن وہاں عملاً ایسا دکھائی دیتا ہے' جیسے غیر مسلم حاکم ہوں اور مسلمان محکوم۔

اب اپنے گھر کی طرف آیئے۔ آزادی سے پہلے ہندو اور مسلمان دونوں' ہندوستان میں انگریزوں کے محکوم تھے لیکن وہاں بھی' مسلمانوں کی حالت' ہندوؤں کے مقابلہ میں کہیں کمزور تھی۔ ایسا نظر آتا تھا کہ مسلمان انگریز کا بھی محکوم ہے اور ہندو کا بھی۔ وہاں ہماری آبادی کا نوّے فیصد حصّہ ہندوؤں کا مقروض ہوتا تھا۔ وہ تعلیم میں ہم سے آگے تھے' کاروبار میں ہم

سے آگے تھے۔ دولت ان کے پاس بے شمار تھی۔ حکومت میں بھی انہیں کا زیادہ حصہ تھا۔ وہاں اب بھی کروڑ سے زیادہ مسلمان بستے ہیں' لیکن ان کی جو حالت ہے' وہ ظاہر ہے۔ نہ ان کی جان محفوظ ہے نہ مال' نہ عزّت محفوظ ہے نہ عصمت' نہ ان کی عبادت گاہیں محفوظ ہیں نہ خانقاہیں۔ حتیٰ کہ ان کے قبرستان تک بھی غیر محفوظ ہیں۔ وہاں کے ہندو جہاں سے جی چاہے مسلمانوں کو نکال دیتے ہیں اور جدھر جی چاہے انہیں دھکیل دیتے ہیں۔ یہ ان کے خلاف آواز تک نہیں نکال سکتے اور اگر آواز نکالیں بھی تو اس کا سننے والا کوئی نہیں۔ یہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کی حالت ہے۔ اب رہا پاکستان' سو ہمیں خدا کے فضل سے مکمل آزادی حاصل ہے (خدا ہماری آزادی کو سلامت رکھے) لیکن دیکھئے کہ یورپ' امریکہ' چین' روس وغیرہ کی غیر مسلم آزاد حکومتوں کے مقابلہ میں ہماری کیا حالت ہے؟ ہم ہر بات میں ان سے پیچھے ہیں اور زندگی کی بہت سی ضروریات میں ان کے محتاج ہیں۔ پھر ملک کے اندر ہماری حالت یہ ہے کہ قریباً آدھی آبادی جھونپڑیوں میں رہتی ہے' انہیں مکان تک میسّر نہیں۔ کتنی آبادی ہے جو رات کو بھوکی سوتی ہے' انہیں پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ کتنے لوگ ہیں جنہیں تن ڈھانپنے کو کپڑا تک میسّر نہیں۔ ہماری کتنی مائیں' بہنیں' بیٹیاں' ہیں جو گھروں سے اس لئے باہر نہیں نکل سکتیں کہ ان کے پاس ستر ڈھانپنے کے لیے پورا کپڑا نہیں۔ ہمارے کتنے مریض ہیں' جو بے علاج مر جاتے ہیں' کتنے لوگ ہیں جن کے بچے انکے سامنے تڑپ تڑپ کر جاں دے دیتے ہیں' لیکن ان کے پاس دوائی خریدنے کے لئے چار پیسے نہیں ہوتے۔

کتنے ایسے ہیں جنہیں کفن و دفن کے لئے گھر کے برتن تک بیچنے پڑتے ہیں۔ ہمارے کتنے بچے ہیں جو اسکولوں میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے گلیوں میں آوارہ پھرتے رہتے ہیں۔ کتنے ایسے ہیں جو فیس اور کتابوں کیلئے پیسے نہ ہونے کی وجہ سے ان پڑھ اور جاہل رہ جاتے ہیں۔ کتنی جوان لڑکیاں اس لئے گھروں میں بیٹھی ہیں کہ ان کے ماں باپ کے پاس اتنا نہیں کہ وہ انہیں گھر سے باعزّت اُٹھا سکیں۔

اور یہ حالت صرف ہماری ہی نہیں، افغانستان، ایران، عراق، شام، حجاز وغیرہ جس ملک میں جائیے، وہاں یہی حالت نظر آئے گی بلکہ اس سے بھی بدتر حالت۔ حتیٰ کہ اگر آپ یورپ کے ان ملکوں میں جائیں جہاں مسلم اور غیر مسلم اکٹھے رہتے ہیں، وہاں بھی مسلمان اپنی ابتر حالت کی وجہ سے غیر مسلموں سے نمایاں طور پر الگ نظر آئیں گے۔ پھٹے پرانے کپڑے، ٹوٹے پھوٹے بوسیدہ مکان، ان کے چہروں سے نظر آجاتا ہے کہ وہ کس قدر مُفلس اور نادار ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جہاں مُفلسی اور ناداری ہوگی وہاں ہزار قسم کے عیب بھی آجائیں گے۔

اب آپ ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ جیسا کہ اُوپر کہا گیا ہے، یہ مسلمان دنیا کے مختلف حصّوں میں رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ان کے جغرافیائی حالات مختلف ہیں، آب و ہوا مختلف ہے، رہنے سہنے کے طریقے مختلف ہیں، زبانیں مختلف ہیں لیکن ان سب میں صرف ایک چیز مشترک ہے یعنی یہ سب مسلمان ہیں، ان کا مذہب ایک ہے۔

قدرِ مشترک مذہب ہے

اب سوچئے کہ اگر کوئی غیر مسلم، ان

حالات کو سامنے رکھ کر اس نتیجے پر پہنچے کہ دنیا کی قوموں میں مسلمانوں کی پستی اور غریبی، کمزوری اور ناداری کا باعث ان کا مذہب ہے، تو ہمارے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں یہ بات بُری لگے گی۔ کوئی شخص بھی اپنے مذہب کے خلاف اس قسم کی بات سُننے کے لئے تیار نہیں ہوتا، اسے اس سے غصّہ آجاتا ہے۔ لیکن غصّہ آجانے سے اس غیر مسلم کے اعتراض کا جواب تو نہیں مل سکتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس کی وجہ، کہ مسلمان دنیا میں جہاں بھی ہے ذلیل اور پست ہے، اس کا مذہب نہیں تو پھر اس کی اصلی وجہ کیا ہے؟ میں آپ سے عرض کرونگا کہ آپ اس بات کو اچھی طرح سے سوچئے، گھر جا کر سوچئے۔ اپنے آپ بات سمجھ میں نہیں آتی تو کسی دوسرے سے پوچھئے اور پھر دیکھئے کہ کیا ہمیں کہیں سے اس بات کا اطمینان بخش جواب مل سکتا ہے کہ مسلمان دنیا میں جہاں بھی ہے ذلیل اور خوار کیوں ہے؟ مفلس اور نادار کیوں ہے؟ دوسروں سے پیچھے کیوں ہے؟ غیروں کا محتاج کیوں ہے؟ ان کے در کا بھکاری کیوں ہے؟

اس کا جواب اس سوال کا جواب آپ کو اور تو کہیں سے نہیں ملے گا لیکن اگر آپ مسجد میں خطبہ یا وعظ سُنیں گے، تو وہاں آپ کو یہ آواز سنائی دے گی کہ مسلمان اس لئے ذلیل اور خوار ہے کہ اس نے مذہب کو چھوڑ دیا ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ بتائی جائے گی کہ مغرب کی تعلیم نے قوم کو لا مذہب بنا دیا ہے۔ یہ نماز نہیں پڑھتے، روزے نہیں رکھتے، سُوٹڈ بُوٹڈ رہتے ہیں، ڈاڑھی منڈواتے ہیں، کلبوں میں جاتے ہیں، وہاں ناچتے کودتے ہیں۔ ان کی بیویاں پردہ نہیں کرتی ہیں، میک اَپ کرتی ہیں، سینما جاتی ہیں

وغیرہ وغیرہ۔ کہنے والے تو یہ کچھ کہہ کر چلے جاتے ہیں‘ لیکن آپ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ کیا مسلمانوں کی ذلّت اور پستی کی وجہ یہی ہے کہ جو ہمیں بتائی جاتی ہے؟ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ دنیا میں جو قومیں ہم سے آگے ہیں اور جن کے ہم محتاج رہتے ہیں‘ وہ بھی یہی کچھ کرتے ہیں۔ انہوں نے بھی اپنے اپنے مذہب کو چھوڑ رکھا ہے۔ وہ بھی کلبوں میں جاتے ہیں‘ ناچتے کودتے ہیں۔ ان کی عورتیں بھی بناؤ سنگھار کرتی ہیں‘ جیم خانوں میں جاتی ہیں۔ پھر وہ ہم سے آگے کیوں ہیں؟ دوسری طرف یہ بھی دیکھئے کہ ہم میں سے بہت تھوڑے لوگ ہیں جنہوں نے مذہب کو چھوڑ رکھا ہے۔ باقی سب مذہب کے پابند ہیں۔ وہ نماز پڑھتے ہیں‘ روزے رکھتے ہیں۔ ان کا لباس‘ وضع قطع‘ سب مذہب کے مطابق ہیں۔ ان کی بیویاں پردہ کرتی ہیں۔ وہ نہ کلبوں میں جاتے ہیں نہ جیم خانوں میں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی حالت بھی ویسی ہی ہے جیسی دوسرے مسلمانوں کی۔ مذہب کی پابندی نے ان کی حالت کو بہتر نہیں بنا دیا۔ بلکہ آپ غور سے دیکھئے تو صاف نظر آجائے گا کہ غریب لوگ مذہب کے زیادہ پابند ہوتے ہیں‘ لیکن مذہب کی پابندی ان کی حالت کو کبھی نہیں سنوارتی‘ وہ بدستور غریب اور نادار رہتے ہیں۔ مصیبتوں کی زندگی بسر کرتے اور تکلیفیں اُٹھاتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ یہ اس اعتراض کا صحیح جواب نہیں ہو سکتا۔

یہ اعتراض ہی غلط ہے اس اعتراض کا جواب اکثر لوگوں کی طرف سے آپ کو یہ ملے گا کہ یہ اعتراض ہی غلط ہے۔ اگر مسلمان غریب ہیں‘ ان کے پاس دولت اور قوت نہیں‘ وہ دنیا کی قوموں سے پیچھے ہیں‘ وہ کمزور

ہیں، ان کے پاس کھانے کو روٹی، پہننے کو کپڑا اور رہنے کو مکان نہیں، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ذلیل اور پست ہیں۔ دنیا کی نظروں میں، بے شک، وہ ایسے ہی ہوں گے، لیکن خدا کی نظروں میں وہ ایسے نہیں۔ خدا کے نزدیک عزّت اور ذلّت کا معیار ہی دوسرا ہے۔ دنیا کا مال و دولت فتنہ ہے۔ جس قدر انسان اس فتنہ سے دُور رہے، اسی قدر وہ خدا کا مقرب ہو جاتا ہے۔ سب سے زیادہ باخدا وہ ہے جو سب سے زیادہ دنیا سے نفرت کرے۔ دنیا مُردار ہے اور اس کا طالب کُتّا۔ مومن دنیا میں اس طرح رہتا ہے جس طرح جیل خانے میں قیدی۔ یہ دنیا کافروں کے لئے اور آخرت مسلمانوں کے لئے ہے۔ اگر انہیں اس چند روزہ دنیا میں تکلیفیں بھی پہنچتی ہیں، تو کوئی بات نہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے آزمائش ہے، وہ اپنے بندوں کی آزمائش کرتا رہتا ہے۔ جو ان تکلیفوں کو صبر سے برداشت کر لیتا ہے، وہ اس آزمائش میں پُورا اُترتا ہے۔ اس کے لئے آخرت میں جنّت کا گھر ہے اور حقیقی زندگی ہے ہی آخرت کی۔ جس کی عاقبت سنور جائے، سمجھ لو کہ اسے سب کچھ مل گیا۔ یاد رکھو! رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، وہ جس کی روزی چاہے تنگ کر دے، جسے چاہے خوشحال کر دے۔ وہ جسے چاہے عزّت دے، جسے چاہے ذلّت دے۔ انسان کو ہر حال میں راضی برضا رہنا چاہیے۔ جو شخص رزق کی تنگی، غریبی، محتاجی، مصیبت، تکلیف کا شکوہ کرتا ہے، وہ خدا کے فیصلوں پر اعتراض کرتا ہے۔ وہ رضائے باری تعالیٰ پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ بندے کو کیا حق ہے کہ اپنے مالک کے کسی فیصلے پر اعتراض کرے۔ جو کچھ اس کی طرف سے ملے انسان کو چاہیئے کہ اس پر

مطمئن رہے۔ یہی اللہ کے نیک بندوں کی نشانی ہے۔ اس لئے یہ خیال کبھی دل میں نہ لانا چاہیئے کہ چونکہ مسلمان غریب اور محتاج ہیں، اس لئے یہ ذلیل و خوار ہیں۔ غریبی اور محتاجی خدا کی رحمت ہے۔ یہ ہے وہ وعظ جسے ہم ہر مسجد و منبر سے اپنے بچپن سے سنتے چلے آرہے ہیں اور جسے آج بھی ہر واعظ دہراتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ واقعی اسلام کی تعلیم ہے؟ کیا قرآن شریف کا یہی حکم ہے؟ کیا خدا کا یہی منشاء ہے کہ مسلمان غریب اور محتاج رہیں؟ کیا دنیا کی ذلّت اور خواری خدا کے مقرب بندوں کی نشانی ہے؟

ہم اپنے دل سے ان سوالات کا جواب کچھ ہی کیوں نہ دے لیں، لیکن قرآن شریف کی تو یہ تعلیم نہیں۔ خدا کا تو یہ حکم نہیں۔ اس کی تعلیم تو یہ ہے کہ **وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ** (۴۵:۱۳) زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اسے خدا نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے کہ تم اس سے کام لو۔ وہ سچے اور پکے مومنوں کی نشانی یہ بتاتا ہے کہ **لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ** (۸:۴) ان کیلئے حفاظت کا سامان اور عزت کی روزی ہے۔ وہ خدا کے دوستوں کے متعلق کہتا ہے کہ **لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ** (۱۰:۶۴) ان کے لئے اس دنیا کی زندگی میں بھی خوشخبری ہے اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ یہ خدا کا قانون ہے جو کبھی بدل نہیں سکتا۔ وہ مومنوں کو دعا ہی یہ سکھاتا ہے کہ **رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً** (۲:۲۰۱) اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس دنیا میں بھی

خوشگوار زندگی عطا کر دے اور آخرت میں بھی خوشگوار زندگی۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ: **لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ ط** (۳۹:۱۰) جو لوگ نیک عمل کرتے ہیں ان کی اس دنیا کی زندگی بہت خوشحال ہو جاتی ہے۔ وہ ایمان اور اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں حکومت اور سلطنت قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ **وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص** (۲۴:۵۵) خدا نے وعدہ کر رکھا ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں گے اور اعمالِ صالح کریں گے وہ انہیں اس دنیا میں حکومت عطا کرے گا جس طرح اس نے ان سے پہلی قوموں کو حکومت عطا کی تھی۔ وہ اس میں جنّتی زندگی کی علامت یہ بتاتا ہے کہ **اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَلَا تَعْرٰى ۙ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝** (۲۰:۱۱۸-۱۱۹) اس میں نہ انسان بھوکا رہے گا نہ ننگا' نہ اسے پیاس کا خوف ہوگا نہ مکان کی تنگی۔

اس کے برعکس' وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ **وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰى ۝** (۲۰:۱۲۴) جو میرے احکام سے رُوگردانی کرے گا ہم اس کی روزی تنگ کر دیں گے اور وہ قیامت کے دن بھی اندھا اُٹھایا جائے گا۔

آپ اس آیت سے یونہی آگے نہ گزر جائیے۔ ذرا ٹھہر کر اس پر غور کیجئے۔ یہ سورہ طٰہٰ کی ایک سو چوبیسویں آیت ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں فرمایا ہے کہ جو لوگ خدا کے احکام سے رُوگردانی کریں

گے ان کی روزی تنگ ہو جائے گی اور وہ قیامت میں بھی اندھے ہی اُٹھیں گے۔ آپ سوچ لیجئے کہ دنیا میں روزی کا تنگ ہو جانا کس قدر خدا کا عذاب ہے کہ جس سے انسان کی عاقبت بھی خراب ہو جاتی ہے۔ دوسری جگہ اس نے کہا ہے کہ جو قوم کُفرانِ نعمت کرتی ہے: **فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ** (۱۶:۱۱۲) اللہ اسے بھوک اور خوف کا مزہ چکھاتا ہے اور جس پر خدا کا عذاب آتا ہے اس کی نشانی یہ ہے کہ **لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ** (۲۲:۹) وہ اس دنیا میں ذلیل و خوار ہو جاتا ہے' اس کے لئے **عَذَابًا اَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا** (۹:۷۴) ہوتا ہے' یعنی اس دنیا میں دردناک عذاب۔ اس نے بتایا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے خدا کے احکام سے منہ موڑا تو **ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ** (۲:۶۱) اس پر ذلّت و خواری کا عذاب آگیا اور وہ خدا کے غضب کے مستحق ہو گئے۔

ان آیات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ اس دنیا میں ذلّت اور رسوائی کی زندگی خدا کا عذاب ہے۔ غریبی اور محتاجی' مُفلسی اور ناداری' روزی کی تنگی' لباس اور مکان کی محتاجی' ان لوگوں کے حصّے میں آتی ہے جن پر خدا کا غضب ہو۔ اس کے برعکس' خدا کے محبوب بندوں کو رزق کی فراوانی حاصل ہوتی ہے۔ انہیں ہر طرح کی خوشحالی میسّر ہوتی ہے' عزّت کی روٹی ملتی ہے۔ حکومت اور سلطنت حاصل ہوتی ہے۔ زمین اور آسمان کی قوتیں ان کے حکم کے نیچے ہوتی ہیں۔ وہ دنیا کی قوموں میں بڑی باعزّت زندگی بسر کرتے ہیں۔ حتّٰی کہ خداوند تعالیٰ نے کُھلّم کھلے الفاظ میں بتا دیا کہ: **وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا** (۴:۱۴۱) یہ ہو نہیں

سکتا کہ غیر مسلم کبھی مسلمانوں پر غالب آجائیں۔ ان کے لئے خدا کا فیصلہ ہے کہ: وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳ : ۱۳۸) اگر تم مومن ہو تو پھر تم سب پر غالب رہو گے۔

لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ خدا کے مقرّب بندوں کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں غریبی اور مفلسی، محتاجی اور ناداری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ خدا کے مقرّب بندے عزّت اور حکومت، غلبہ اور قوّت، خوش حالی اور سربلندی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے اور خدا کے فیصلوں میں کبھی تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی قوم کسی حادثہ کی وجہ سے کسی وقت کمزور ہو جائے اور لوگ غریب اور محتاج ہو جائیں، لیکن کسی حادثہ کی وجہ سے ایسا ہو جانا اور بات ہے اور کسی قوم کا مستقل طور پر ایسا ہو جانا اور اس کا اس حالت پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا، بلکہ اسے اللہ کی رحمت سمجھ لینا اور۔ بعض مسلمان قومیں تو صدیوں سے اس حالت میں چلی آرہی ہیں۔

عزّت کی روٹی کیسے ملتی ہے؟

یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ قرآنِ کریم کی رُو سے دنیا میں عزّت کی زندگی، جس میں سامانِ زیست کی فراوانی ہو اور اس کے لئے کسی بالا دست قوّت کا خوف دامن گیر نہ ہو، انسانیت کے شایانِ شان زندگی ہے۔ بھوک اور خوف کی زندگی خدا کا عذاب ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ دنیا میں سامانِ زیست اور قوّت و ثروت جس سے دوسروں کا خوف باقی نہیں رہتا، حاصل کس طرح ہوتی ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ کائنات، قوانینِ فطرت (Laws of Nature) کے

مطابق چل رہی ہے۔ اس لئے طبعی زندگی کے سامانِ زیست کے حصول کے لئے فطرت کے قوانین کا اِتّباع کرنا ہوگا۔ اس میدان میں ہر انسان برابر ہے۔ مومن اور کافر کی کوئی تمیز نہیں۔ جب دونوں کی طبیعی زندگی ایک ہی قانون کے تابع ہے‘ تو اسبابِ زندگی کے حصول کے لئے قوانین بھی ایک ہی ہوں گے۔ جس طرح ایک غیر مسلم سانس لے کر زندہ رہتا ہے‘ اسی طرح ایک مسلمان کیلئے بھی ہوا وجہِ زیست ہے۔ جس طرح وہ غذا کا محتاج ہے اسی طرح یہ بھی ہے۔ سنکھیا کا اثر دونوں پر یکساں ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک یہودیہ نے رسول اللہؐ کے کھانے میں زہر ملا دیا تھا تو اس زہر کا اثر حضورؐ کے جسمِ اطہر پر بھی اسی طرح ہوا جس طرح کسی دوسرے انسان کے جسم پر ہوتا ہے۔ لہٰذا متاعِ حیات اور سامانِ زندگی کے حصول کے لئے ہر انسان کے لئے یکساں قانون ہیں۔ اس میں مومن اور کافر کی کوئی تمیز نہیں۔ جب خدا نے کہا ہے کہ: **وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے‘ ہم نے تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے) تو اس کا مخاطب انسان ہے‘ صرف مسلمان نہیں۔ جو انسان تسخیرِ فطرت کے لئے جدوجہد کرے گا‘ فطرت اپنے چھپے ہوئے خزانے اس کے حوالے کر دے گی۔ اس میں مسلم و غیر مسلم کی تمیز نہیں ہوگی۔ خدا نے آدمی کو "خلیفہ فی الارض[1]" کہا ہے اور آدمی ہی کو علم الاسماء (علم اشیائے

---

[1] قرآن نے انسان کو خلیفہ فی الارض کہا ہے لیکن ہم نے اسے "خلیفۃُ اللہ فی الارض" سمجھ لیا (یعنی زمین میں خدا کا نائب)۔ جب اس سے یہ دشواری پیش آئی

(باقی اگلے صفحے کے نیچے دیکھیں)

فطرت) دیا ہے۔ لہٰذا، جو انسان اس علم سے فائدہ اُٹھانا چاہے، اُٹھالے۔ اس باب میں فطرت نہ کسی سے بخل کرے گی نہ کسی کی رعایت۔ اس کیلئے اس ضمن میں مسلم وغیر مسلم، مومن و کافر سب برابر ہیں۔ مومن و کافر کا فرق متاعِ فطرت کے استعمال میں جا کر ہوگا۔ جس کی تفصیل ذرا آگے چل کر ملے گی۔ تسخیرِ فطرت کی جدوجہد کے نتائج میں کچھ فرق نہیں ہوگا۔

(پچھلے صفحہ سے مسلسل)

کہ کیا فرعون، نمرود بھی خلیفۃُ اللہ ہو سکتے ہیں، تو پھر اس "خلافتِ الٰہیہ" کو مومنین کے لئے مخصوص کر دیا، حالانکہ قرآن نے آدم کو کہیں خلیفۃُ اللہ فی الارض نہیں کہا۔ خلیفہ کے معنی کسی کے پیچھے آنے والا (Successor) "جانشین" کے ہیں۔ زمین میں آدمی سے پہلے جو نوع آباد تھی، آدمی اس نوع کا جانشین ہے، یعنی اس کی جگہ اب یہ آباد ہے۔ یہ ہے مفہوم خلیفہ فی الارض کا، یعنی زمین میں انواعِ سابقہ کا جانشین، نہ کہ اللہ کا نائب۔ اسی آدم (نوعِ انسانی) کو اللہ نے علمِ اسمائے فطرت دیا تھا جو اس سے پہلی آبادی کو حاصل نہیں تھا۔ وہ نوع سلسلۂ ارتقاء میں اس سے پیچھے تھی۔ لہٰذا دنیا میں سابقہ آبادیوں کے جانشین ہونے اور تسخیرِ فطرت کے علم کے وارث ہونے میں مومن و کافر کی کوئی تمیز نہیں۔ مومن و کافر کی تمیز آگے چل کر آتی ہے جہاں ماحصل تسخیرِ فطرت کے استعمال کا سوال آتا ہے۔

خدا کی نیابت کا تصوّر اس لئے بھی غلط ہے کہ نیابت اس کی ہوتی ہے جو خود موجود نہ ہو۔ اللہ ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے، اس لئے اس کی نیابت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مومن کا فریضہ قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "ابلیس و آدم" عنوان "آدم"۔

دیکھئے قرآن کس قدر وضاحت سے کہتا ہے:۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ
اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ (۱۱:۱۵)

جو دنیا کی زندگی اور زینت چاہتا ہے‘ ہم ان کی
جدوجہد کا پورا پورا ماحصل اسی دنیا میں دیتے ہیں۔
اس میں ان کے لئے کوئی کمی نہیں کی جاتی۔

اس سلسلہ میں سورہ بنی اسرائیل کی آیات (۱۸:۲۱) بھی دیکھئے جن سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ تنقیحاتِ بالا سے حسب ذیل نتائج ہمارے سامنے آگئے:

۱ دنیاوی زندگی میں سامانِ زندگی کی فراوانی اور بے خوفی ہی شایانِ شانِ انسانیت ہے۔

۲ سامانِ زیست تسخیرِ فطرت سے ملتا ہے۔

۳ فطرت کے ذخائر ہر اس شخص اور قوم کے ہاتھ آسکتے ہیں جو اُن کے لئے جدّوجُہد کرے۔ اس میں مومن اور کافر کی کوئی تمیز نہیں۔

۴ جو قوم تسخیرِ فطرت میں جدّوجُہد نہ کرے‘ وہ متاعِ حیات سے محروم رہ جاتی ہے۔

۵ اور متاعِ حیات سے محرومی یا اس کے لئے دوسروں کی محتاجی ذلّت کی زندگی اور خدا کا عذاب ہے۔

دنیا اور آخرت کا مفہوم

اب آگے بڑھیئے! قرآنِ کریم میں ایسی آیات بھی ملتی ہیں جن میں "دنیاوی متاع" کو حقیر و قلیل کہا گیا ہے اور

اس کے مقابلے میں "آخرت" کو کثیر و پائیدار۔ یہی وہ آیات ہیں جن سے "قدامت پرست" طبقہ نے سہارا پکڑا اور "دنیائے ناثبات" کی تمام "متاعِ حقیر و ذلیل" کو کفّار کا حصّہ بنا دیا اور آخرت خدا کے پیاروں کے لئے مخصوص کر لی۔ لہٰذا' قرآن کے ان مقامات کا صحیح طور پر سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ یہ مقام ذرا مشکل ہے۔ اس لئے مشکل ہے کہ اس میں ایک ایسی بات سامنے آئے گی جو شاید اکثر قارئین کیلئے بالکل نئی ہو۔ لہٰذا' یہ مقام ذرا گہرے غور و فکر کا محتاج ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن' انسان کی پیدائش سے لے کر اس کی طبیعی موت تک کے عرصہ کو دنیا کی زندگی قرار دیتا ہے اور موت کے بعد کی زندگی کو حیاتِ اُخروی سے تعبیر کرتا ہے۔ حیاتِ اُخروی (یعنی موت کے بعد کی زندگی) پر ایمان' مسلمان ہونے کیلئے لاینفک ہے۔ جو اس سے انکار کرتا ہے وہ مومن نہیں ہو سکتا' خواہ وہ دوسری تمام باتوں پر ایمان رکھے۔

لیکن

(اور یہ "لیکن" بہت اہم ہے) دنیا اور آخرت کے الفاظ سے قرآن کا فقط یہی مفہوم نہیں۔ وہ ان الفاظ کو اور معنوں میں بھی استعمال کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن بہت سے الفاظ کو بطور اصطلاحات استعمال کرتا ہے اور جب تک ان قرآنی اصطلاحات کا صحیح مفہوم نہ سمجھ لیا جائے' قرآن کا صحیح صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا۔ قرآن فہمی کی راہ میں یہ ایک ایسا اہم نکتہ ہے جسے نظر انداز کر دینے سے وہ تمام اُلجھاؤ پیدا ہو گئے' جو آج

ہمارے لئے وجہ پریشانی قلب و نظر بن رہے ہیں اور جن کی وجہ سے ہزار کوشش کے باوجود ' ہم قرآن کے صحیح مفہوم تک نہیں پہنچ پاتے (بلکہ بعض اوقات قرآنی مفہوم میں اس قسم کی اُلجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں جن سے باہر نکلنا مشکل ہو جاتا ہے) اور انسان قرآنی آیات کو (معاذ اللہ) چیستان سمجھنے لگتا ہے۔ لہٰذا قرآن فہمی کی صحیح صورت یہ ہے کہ قرآن کی ان اصطلاحات کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ ان اصطلاحاتِ قرآنیہ میں "دنیا" اور "آخرت" کی اصطلاحات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان اصطلاحات تک پہنچنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر سن لیجئے کہ اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ حیات بعد الممات کا عقیدہ صحیح نہیں۔ حیات بعد الممات تو ایک ایسی حقیقت ہے جس پر ہمارے ایمان کی بنیاد ہے۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے جو یہاں سے وہاں تک مسلسل چلی جاتی ہے۔ لہٰذا' قرآن میں جہاں آخرت سے مراد حیات بعد الممات ہے' وہاں اس سے حیات بعد الممات ہی مراد ہے۔ جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ قرآن نے دنیا اور آخرت کے الفاظ کو صرف' اسی مفہوم کیلئے استعمال نہیں کیا' بلکہ اصطلاحی طور پر ان الفاظ کو اور معنوں میں بھی استعمال گیا ہے اور اس وقت ہمارے سامنے ان ہی اصطلاحی معانی کی وضاحت ہے۔

"دنیا" کے لفظی معنی ہیں "قریبی" اور "آخرت" کے معنی ہیں "بعد میں آنے والا"۔ اسی کو بالفاظ دیگر مستقبل (Future) کہا جاتا ہے۔ ایک فرد یا ایک، قوم کی زندگی میں ایک مستقبل اسی دنیا میں آتا ہے' لیکن (قرآنی نقطہ نگاہ سے) اس مستقبل کے علاوہ دوسرا مستقبل' اس زندگی کے بعد کی

زندگی میں آتا ہے۔ لہٰذا، مستقبل دو طرح کا ہوتا ہے، اس زندگی میں اور اس کے بعد کی زندگی میں۔ ہم پہلے اس زندگی کے مستقبل کے متعلق گفتگو کریں گے اور بعد میں مرنے کے بعد کی زندگی کے مستقبل کے متعلق۔

پہلے اس زندگی کے مستقبل کو لیجئے۔ دنیا میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو ہمیشہ پیش پا اُفتادہ، قریبی مفاد (Immediate Gain) کے پیچھے لپکتے ہیں۔ ان کی تمام تگ و تاز مفادِ عاجلہ کے لئے ہوتی ہے۔ ان کے سامنے صرف اپنا آپ ہوتا ہے۔ انہیں اس کی فکر نہیں ہوتی کہ بعد میں آنے والوں کا کیا حشر ہوگا؟ وہ فقط اپنے عیش و آرام کی سوچتے ہیں۔ انہیں اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ آنے والی انسانیت (Humanity) پر کیا گزرے گی۔ اس کی ساری جدوجُہد "حال" کے لئے ہوتی ہے۔ "مستقبل" کی انہیں کچھ فکر نہیں ہوتی۔ قرآن اِن پیش پا اُفتادہ، قریبی مفادِ عاجلہ کو "دنیا" سے تعبیر کرتا ہے اور مستقبل کا نام "آخرت" رکھتا ہے۔ لہٰذا، ان اصطلاحی معانی کی رُو سے اس کے نزدیک "متاعِ دنیا" سے مفہوم ہے وہ مفاد جو انسان صرف اپنی ذات کے لئے تلاش کرتا ہے اور "سامانِ آخرت" سے مقصود ہے وہ متاع جسے آنے والی نسلوں کے لئے جمع کرتا ہے۔ قرآن کی رُو سے نسل سے مراد کسی انسان یا خاندان کی اپنی نسل نہیں بلکہ آنے والی پوری انسانیت ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ جو شخص (یا قوم) مفادِ عاجلہ (یعنی صرف اپنے حال کی خوشگواری) کے لئے کوشش کرتا ہے، اس کا حال تو خوشگوار ہو جاتا ہے لیکن اس کا مستقبل روشن نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس انسانیت کی، صحیح زندگی یہ ہے کہ انسانی کوششیں صرف حال کی

خوشگواری ہی میں نہ صرف ہو جائیں، بلکہ آنے والی انسانیت (یعنی مستقبل) کی خوشگواری کے لئے بھی جدّوجُہد کی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ پیش پا اُفتادہ مفاد اپنے اندر بڑی کشش و جاذبیت رکھتے ہیں۔ ان کی درخشندگی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دیتی ہے، اس سے عیش و آرام کی زندگی ملتی ہے۔ اس میں محنت کم کرنی پڑتی ہے اور نتائج فوراً سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن اس نظریہ کے ماتحت زندگی بسر کرنے والوں کا مستقبل تیرہ و تار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس قوم کا "آخرت" میں کوئی حصّہ نہیں ہوتا۔ اس باب میں دشواری یہ ہے کہ حال کے پیش پا اُفتادہ مفاد بالکل اُبھرے ہوئے سامنے ہوتے ہیں، لیکن مستقبل کے مفاد نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ لہٰذا، مستقبل کے مفاد کے لئے وہی کوشش کرے گا جسے اس کوشش کے ان دیکھے نتائج پر پورا پورا یقین ہو۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ دو کسان ہیں۔ ان کے پاس ایک ایک من گیہوں ہے، یہی ان کی متاع ہے۔ ان میں سے ایک جاتا ہے اور زمین میں ہل جوت کر اپنی متاعِ حیات کو مٹّی میں ملا آتا ہے۔ دوسرا اس پر ہنستا ہے اور اپنا گیہوں چکی میں پِسوا کر گھر لے آتا ہے۔ اوّل الذکر کو مکئی اور باجرہ کی روٹی پر گزارہ کرنا پڑتا ہے اور بعض اوقات فاقے بھی کاٹنے پڑتے ہیں۔ اس کے برعکس، دوسرے کسان کے بچے مزے سے گیہوں کی روٹی کھاتے ہیں۔ اس کسان کو قریبی خوشحالی تو نصیب ہو گئی لیکن مستقبل میں اس کا کوئی حصّہ نہیں۔ مستقبل اس دوسرے کسان ہی کا روشن ہو گا جس کے گھر ایک ایک دانہ، سات سات سو دانوں کے خوشے اور کھلیان بن کر آئے گا۔ بیج کے فصل بننے تک کا عرصہ تو اسے محنت اور

مشقت سے گزارنا ہوگا' لیکن اس کے بعد ایک ایسا دائرہ (Cyclic Order) قائم ہو جائے گا جس سے اس کا حال خوشگوار ہو جائے گا اور مستقبل بھی روشن۔ لیکن اس کیلئے شرطِ اوّلین اس حقیقت پر یقین ہے کہ میں نے جو دانہ مٹی میں ملا دیا ہے وہ ضائع نہیں جائے گا۔ کائنات میں ایک اٹل قانون جاری و ساری ہے جو اس دانہ کو کونپل میں تبدیل کر دے گا۔ کونپل ڈنٹھل بنے گی۔ ڈنٹھل میں خوشہ آئے گا اور خوشہ جھولیاں بھر بھر کر اناج دے دیگا۔ اسے اپنی محنت اور کائنات کے اس اٹل قانون پر یقینِ محکم ہونا چاہیئے۔ اگر اس پر یقین نہیں' تو وہ کبھی اپنے دانے مٹی میں نہیں ملائے گا' یہ بھی اُنہیں دوسرے کسان کی طرح پِسوا کر گھر لے آئے گا۔ کائنات کا یہ قانون' جو دانے کو خوشے میں تبدیل کر دیتا ہے' سُنَّتَ اللّٰہِ (قانونِ خداوندی) کہلاتا ہے' جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی (وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا (۳۳ : ۶۲) اس کا اٹل اور غیر متبدّل ہونا ہی اس پر ایمان کا ضامن ہوتا ہے۔ اگر کسان کو اس کا یقین نہ ہو کہ دانہ ضرور خوشہ بن جائے گا' تو وہ اپنے دانوں کو مٹی میں ملانے کا خطرہ (Risk) کبھی مُول نہیں لے گا۔ چونکہ انسان کو قرنہا قرن کے تجربے[1] نے بتا دیا ہے کہ فطرت کے اس قانون میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی کہ جب دانے کو ایک خاص قاعدے کے مطابق مٹی میں ملا دیا جائے تو وہ خوشہ میں تبدیل ہو کر

---

[1] انسانوں کا تجربہ جو نسلاً بعد نسلٍ متوارث آگے چلا آتا ہے' تاریخ کہلاتا ہے۔ قرآن تاریخ کو اسی لئے بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس کے لئے اس نے ذکر کی اصطلاح اختیار کی ہے (تفصیل کسی دوسرے مقام پر ملے گی)۔

رہتا ہے۔ اس لئے وہ اس یقینِ محکم کے ماتحت بیج کو مٹّی میں ملا کر نہایت اطمینان سے انتظار کرتا ہے۔

ہم نے اُوپر کہا ہے کہ کسان کو اس امر کا یقین ہوتا ہے کہ اگر دانے کو ایک خاص قاعدہ کے مطابق مٹّی میں ملا دیا جائے اور پھر خاص قاعدے کے مطابق اس کی دیکھ بھال کی جائے تو وہ فصل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہاں سے دوسری شرط سامنے آگئی۔ یعنی دانہ کو ایک خاص قاعدے اور اصول کے مطابق مٹّی میں ملایا جائے اور اس کے بعد وقت پر پانی دیا جائے۔ اس پروگرام میں دیکھئے بیک وقت دو کوششیں مصروفِ کار نظر آئیں گی۔ ایک فطرت کا غیر متبدّل قانون اور دوسرے خاص قاعدے کے مطابق کسان کی محنت۔ اگر ان دونوں میں ہم آہنگی ہو گی' تو خوشگوار نتیجہ برآمد ہو کے رہے گا (اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں)۔ اگر کسان کی کوششیں' قانونِ فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہوں گی تو اس کی محنت رائیگاں جائے گی۔ **اُولٰئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ** (۲ : ۲۱۷)۔ واضح رہے کہ قوانینِ الٰہیہ صرف قوانینِ فطرت کا نام نہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی قوانینِ الٰہیہ ہیں جن کی نگہداشت انسان کے لئے نہایت ضروری ہے۔

تقویٰ یہ قوانین قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ ان تمام قوانین کی پوری پوری نگہداشت کا نام تقویٰ ہے۔ لیکن قوانینِ فطرت ان قوانین کی فہرست سے خارج نہیں' وہ بھی قوانینِ خداوندی کے اندر شامل ہیں۔ لہٰذا ان قوانین کی نگہداشت بھی متقی بننے کے لئے ضروری ہے۔ اسے ایک بار پھر سمجھ لیجئے کہ جس طرح وہ قوم جو صرف قوانینِ فطرت کی نگہداشت کرتی

ہے متّقی نہیں کہلا سکتی اسی طرح وہ قوم بھی متّقی نہیں کہلا سکتی جو قوانینِ فطرت کی نگہداشت نہیں کرتی۔ البتّہ جو قوم قوانینِ فطرت کی نگہداشت کرتی ہے' اسے اس کے نتائج حاصل ہو جائیں گے' خواہ وہ باقی قوانین کی اطاعت کرے یا نہ کرے اور جو قوم قوانینِ فطرت کی نگہداشت نہیں کرے گی' وہ ان کے نتائج سے محروم رہ جائے گی۔

یہ ہے "آخرت" (مستقبل) کا وہ مفہوم جس کا تعلّق اس دنیا سے ہے۔ اب ہم اس کے دوسرے مفہوم کی طرف آتے ہیں۔

آخرت کا دوسرا مفہوم

ایک نظریۂ زندگی یہ ہے کہ انسان کی زندگی صرف اس دنیا کی زندگی ہے' موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انسانی زندگی سے مقصود صرف دنیا کا مال و متاع اکٹھا کرنا اور عیش و آرام کی زندگی بسر کرنا ہے۔ اس کے لیے جو تدبیر مناسب سمجھی جائے اختیار کی جا سکتی ہے۔ بس اتنا دیکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ بات' حکومت کے قانون کے خلاف نہ ہو اور اگر اس کے خلاف ہو' تو ایسی کوشش کی جائے کہ انسان پولیس یا عدالت کی گرفت میں نہ آئے۔ حکومت کے قانون کے علاوہ نہ کوئی قانون ہے اور پولیس اور عدالت کی گرفت سے آگے نہ کسی کی گرفت۔ اپنی کامیابی کے لئے جو حربہ استعمال کر لیا جائے' وہ جائز ہے۔

دوسرا نظریۂ زندگی یہ ہے کہ انسان کی طبعی زندگی' حیوانی سطح کی زندگی ہے۔ انسانی زندگی اس سے اُوپر شروع ہوتی ہے۔ انسان صرف اس کے طبعی جسم سے عبارت نہیں' اس میں ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات (Human Personality) کہا جاتا ہے۔

انسانی زندگی کا مقصد، انسان کے جسم کی پرورش اور اس کی ذات کی نشوونما دونوں ہیں۔ جس طرح جسمانی پرورش کے لئے قانون مقرر ہیں اسی طرح انسانی ذات کے لئے بھی قوانین ہیں۔ یہ قوانین وحی کے ذریعے ملتے ہیں اور قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ انہیں مستقل اقدار کہتے ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ دنیاوی سازو متاع حاصل کرنے کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔ لیکن جب کبھی ایسا ہو کہ دنیاوی فائدہ اور مستقل قدر میں ٹکراؤ ہو، تو دنیاوی فائدہ کو مستقل قدر پر قربان کر دے۔ اس سے انسانی ذات کی نشوونما ہو جائے گی۔ اس طرح انسان، اس زندگی کے بعد، اگلی زندگی میں، مزید ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتا جائے گا۔ اسے "حیاتِ آخرت" کہا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کاروبار کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اگر میں اس میں ذرا سا دھوکا دے جاؤں، تو مجھے نہایت آسانی سے ہزاروں روپے کا فائدہ ہو جاتا ہے اور یہ دھوکا اس انداز سے دیا جا سکتا ہے کہ کسی کو علم تک نہیں ہو سکتا اور اگر علم ہو بھی جائے تو تھوڑی سی رشوت دے کر معاملہ صاف کر لیا جا سکتا ہے۔ اگر اس کا ایمان "حیاتِ آخرت" پر نہیں، تو بلا تأمل یہ کاروائی کر گزرے گا۔ لیکن اگر وہ حیاتِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے، تو وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا۔ کیونکہ دیانت داری ایک مستقل قدر ہے اور مستقل قدر کی حفاظت سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی اور اس کی آخرت کی زندگی سنورتی ہے۔ اس کے برعکس، بددیانتی سے اسے دنیاوی مفاد تو حاصل ہو سکتے ہیں، لیکن اس سے اس کی ذات تباہ ہو جاتی ہے۔ پھر اس کا یہ بھی ایمان ہے کہ بددیانتی، پولیس یا عدالت کی

گرفت میں آئے یا نہ آئے‘ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ خدا کا قانونِ مکافات ایسا ہے کہ انسان کا کوئی عمل۔۔۔۔ حتیٰ کہ دل میں گزرنے والا خیال تک بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتا۔ اس کا ہر عمل نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے اور انہی اعمال کے مطابق اس کی حیاتِ اُخروی مرتب ہوتی ہے۔

دوسرے انداز سے اسی حقیقت کو ایک اور انداز سے سمجھئے۔

ہمارے ہاں ایک محاورہ ہے۔ مال‘ صدقۂ جان‘ جان صدقۂ آبرو۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ انسانی زندگی کیلئے مال کی بھی ضرورت ہوتی ہے‘ اس لئے انسان کو چاہیئے کہ مال حاصل کرے اور اس کی حفاظت کرے۔ لیکن جب کبھی ایسا ہو کہ انسان کی جان جانے کا خطرہ ہے‘ تو اس وقت مال خرچ کرنے سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔ جو شخص ایسے وقت میں مال کو سنبھال کر رکھے گا اور اسے جان بچانے کے لئے خرچ نہیں کرے گا‘ اسے ساری دنیا پاگل کہے گی اور اس پر لعنت ملامت کرے گی۔ اس لئے کہ اس نے ایک چھوٹی چیز کو بچانے کی خاطر بڑی چیز کو ضائع کر دیا۔ یہ معنی ہیں مال صدقہ جان‘ کے۔

اب آگے بڑھیئے۔ جان کی حفاظت نہایت ضروری ہے لیکن اگر کبھی ایسا وقت آجائے کہ انسان کی آبرو خطرہ میں ہو‘ تو باغیرت انسان وہ ہے جو جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی آبرو بچا لے۔ جو ایسا کرتا ہے اسے دنیا میں بڑی عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس سے یہ اصول ہمارے سامنے آگیا کہ صحیح روشِ زندگی یہ ہے کہ انسان کسی بڑی چیز کی حفاظت کیلئے چھوٹی

چیز کو قربان کر دے۔

قرآنِ کریم کی رُو سے دنیاوی زندگی کا سازو سامان اپنے اندر جاذبیت رکھتا ہے۔ اسے ضرور حاصل کرنا چاہیے۔ لیکن جب کبھی ایسا ہو کہ دنیاوی زندگی کے کسی فائدہ اور انسان کی ذات کے کسی تقاضے میں ٹکراؤ ہو تو اس وقت انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی ذات کی حفاظت کرے اور دنیاوی فائدے کو اس پر قربان کر دے۔ یہ ہیں وہ مقامات جہاں اس نے کہا ہے کہ حیاتِ آخرت کے مقابلے میں دنیاوی زندگی اور اس کے ساز و سامان بہت حقیر متاع ہے۔ وہ انسانی ذات کی حفاظت کی متاع کو مستقل اقدار سے تعبیر کرتا ہے اور چونکہ اس سے انسانی ذات مرنے کے بعد حیاتِ جاوداں حاصل کر لیتی ہے، اس لئے اسے حیاتِ آخرت قرار دیتا ہے۔

مقصودِ زندگی "دنیا اور آخرت" کے اِن معانی کو سامنے رکھئے اور پھر ان مقامات پر غور کیجئے جن میں قرآن نے صرف دنیا (حال) کے پیش پا اُفتادہ مفاد کو خزف ریزے اور آخرت (مستقبل) کے مفاد کو متاعِ حقیقی قرار دیا ہے۔ ساری بات واضح ہو جائے گی۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ ہر فرد یا قوم اپنے آپ ہی کو سامنے نہ رکھے۔ ایسا کرنے سے انسان، صرف اپنے ذاتی مفاد ہی کو مقصودِ زندگی سمجھ لیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ مقصودِ زندگی نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود ہے، کیونکہ اس سے انسانیت اپنے ارتقائی مدارج طے کرتی اپنے منتہیٰ کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ وہ خود غرض انسانوں (یا اقوام) کو پیش پا اُفتادہ مفاد پر جھپٹ پڑنے والے قرار دیتا ہے اور اس مفاد کو متاعِ دُنیوی (قریبی مفاد) سے تعبیر کرتا ہے۔ ان کے برعکس، وہ انسان

ہیں جو دنیا میں ایسا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں پوری کی پوری انسانیت پروان چڑھے۔ وہ اسے مستقبل کی خوشحالی (آخرت) سے تعبیر کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ قرآن کے نزدیک محض قریبی مفاد (دنیا) کے حصول کی جدّوجہد کبھی مستحسن قرار نہیں پا سکتی۔ اس کے نزدیک حقیقی سعی و طلب انسانیت کی خوشگواری کیلئے ہونی چاہیئے' یعنی پوری کی پوری نوعِ انسانی کی خوشحالی' اپنی اور آنے والی نسلوں کی مرفّہ الحالی' پوری کی پوری ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کی ترقّی۔ اس کے ساتھ ہی قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ یہ جو افراد اس طرح مفادِ خویش کے بجائے انسانیت کا مفادِ کُلّی سامنے رکھتے ہیں اور اس مفاد کے حصول کیلئے کسی مستقل قدر کو نہیں توڑتے' تمام اقدار کی پوری پوری پابندی کرتے ہیں' تو اس سے ان کی ذات کی اس طرح نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے کہ وہ حیاتِ جاوید کے اہل ہو جاتے ہیں۔ یوں اُن کی دنیا(موجودہ زندگی) کی شادمانیوں کے ساتھ حیاتِ اُخروی (مرنے کے بعد کی زندگی) بھی طیّب اور خوشگوار بن جاتی ہے۔

جن گروہوں کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے' قرآن ان کی زندگی اور اس کے مآل کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے تاکہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے۔ وہ کہتا ہے کہ جو لوگ محض پیش پا اُفتادہ مفاد (حال کی بہبود) کی فکر کرتے ہیں' انہیں اپنی کوششوں کے نتائج فوراً مل جاتے ہیں' لیکن ان کا مستقبل میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

دو گروہ

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي

الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (۲ : ۲۰۰)

جو لوگ اس نظریہ کے قائل ہیں کہ انہیں قریبی مفاد ہی مل جانے چاہئیں (انہیں وہ مفاد مل جاتے ہیں) ان کا مستقبل (کی خوشحالیوں) میں کوئی حصّہ نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس' جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان کا حال اور مستقبل دونوں روشن ہوں' انہیں اس کے مطابق حصّے مل جاتے ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○

(۲ : ۲۰۱)

اور جو یہ چاہتے ہیں کہ خدا کا نشوونما دینے والا قانون ایسا کر دے کہ ان کا حال بھی مستحسن ہو جائے اور مستقبل بھی اور اس طرح کہ وہ (بدحالیوں اور نامُرادیوں) کے انسانیت سوز عذاب سے بچ جائیں' تو انہیں ان کی کوششوں کے نتائج اسی طرح مل جائیں گے۔ اس لئے کہ (اللہ کا قانونِ مکافاتِ عمل) نتائج برآمد کرنے میں دیر نہیں لگاتا (جس وقت نتائج پختگی اختیار کر لیتے ہیں' ٹھیک اسی وقت ان کا ظہور ہو جاتا ہے)۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ جو قوم مستقبل کی خوشگواریوں

اور مرفہ الحالیوں کے لئے جدوجہد کرے' اس کا حال تاریک ہو۔ اس لئے کہ مستقبل کی خوشحالی کیلئے ابتدائی جدوجہد کے بعد ایک ایسا دائرہ قائم ہو جاتا ہے جس میں حال اور مستقبل کے کنارے ملتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ کسان والی مثال میں جب وہ ابتدائی مشکلات پر قابو پر کر فصل تیار کر لیتا ہے' تو فصل کے گھر آنے کے ساتھ ہی اس کا حال خوشگوار ہو جاتا ہے اور پھر وہ اگلی فصل کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اس جدوجہد کا ماحصل پھر مستقبل کی مرفہ الحالیوں کی صورت میں سامنے آجاتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا رہتا ہے' یعنی حال اور مستقبل دونوں' روشن اور تابناک۔ اسی لئے فرمایا کہ:

> **لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ** (۳۹ : ۱۰)
>
> جو لوگ حُسنِ عمل کرتے ہیں' ان کی یہ دنیا (حال کی زندگی) حسین بن جاتی ہے اور حال کے ساتھ ان کا مستقبل بھی روشن ہو جاتا ہے۔
>
> **اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ○ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○** (۱۰ : ۶۳ - ۶۴)
>
> جو لوگ (زندگی کے اس صحیح نظریہ پر جو قرآن نے پیش کیا ہے) یقین رکھتے ہیں اور اپنی زندگی اس کے مطابق بسر کرتے ہیں' ان کے لئے حال کی زندگی اور مستقبل' دونوں میں خوشگواریاں ہیں۔ یہ خدا کا ایسا

محکم قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور
یہ بہت بڑی کامیابی اور کامرانی ہے۔

یہاں تک ہم نے دو گروہ دیکھ لئے۔ ایک وہ جو صرف اپنے حال کو دیکھنا چاہتا ہے اور دوسرا وہ جو مستقبل کی درخشندگی پر نگاہ رکھتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اوّل الذکر گروہ کا حال (Present) خوشگوار ہو جاتا ہے، لیکن مستقبل (Future) میں اس کے لئے کوئی حصّہ نہیں ہوتا اور مؤخّرالذکر کا حال اور مستقبل، دونوں خوشگوار ہو جاتے ہیں۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

وَمَنۡ يُّرِدۡ ثَوَابَ الدُّنۡيَا نُؤۡتِهٖ مِنۡهَا ۚ وَمَنۡ يُّرِدۡ
ثَوَابَ الۡاٰخِرَةِ نُؤۡتِهٖ مِنۡهَا (۳ : ۱۴۵)

جو صرف حال کی خوشگواریاں چاہتا ہے، اسے یہ کچھ
مل جاتا ہے، جو مستقبل کی تابناکی کے لئے خواہاں ہوتا
ہے، اسے وہ کچھ مل جاتا ہے۔

خدا کا قانون یہ نہیں کہ جو لوگ صرف حال کی خوشگواریاں چاہیں، وہ ان کی محنت کو بےکار کر دے۔ نہیں، ان کی محنت رائیگاں نہیں جاتی۔ جو صرف پیش پا اُفتادہ مفاد چاہتے ہیں، انہیں یہ مفاد مل جاتے ہیں اور جو مستقبل پر بھی نگاہ رکھتے ہیں، ان کی کوششیں اسی نہج سے بار آور ہوتی رہتی ہیں۔ دیکھئے سورہ بنی اسرائیل میں اس حقیقتِ کبریٰ کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے فرمایا:۔

مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡعَاجِلَةَ عَجَّلۡنَا لَهٗ فِيۡهَا مَا نَشَآءُ لِمَنۡ نُّرِيۡدُ

ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا
(۱۸ : ۱۷)

جو شخص (یا قوم) پیش پا اُفتادہ (فوری) فائدہ چاہتا ہے' تو ہم اپنے قانون کے مطابق اسے مفادِ عاجلہ (فوری فائدہ) دے دیتے ہیں لیکن مستقبل میں اس کیلئے ایسی زندگی ہوگی جس میں ساری صلاحیتیں جُھلس جائیں گی اور اس کی نشوونما رُک جائے گی اور اس زندگی میں وہ اپنے آپ کو بدحال اور ٹھکرایا ہوا پائے گا۔

یہ ایک گروہ ہوا اور دوسرا گروہ:

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ○ (۱۹ : ۱۷)

لیکن جو انسان (یا قوم) مستقبل کا طالب ہو اور اس کے لئے جیسی کوشش کرنا چاہیئے' ویسی کرے اور وہ خدا کی مقرر کردہ مستقل اقدار پر ایمان رکھے تو ان کی یہ کوششیں پورا پورا پھل لائیں گی۔

یہ فطرت کا قانون ہے۔ نہ اوّل الذکر گروہ کی کوششیں ضائع جاتی ہیں اور نہ ثانی الذکر کی۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۲۰ : ۱۷)

ہماری نشوونما دینے والی سہولتیں دونوں گروہوں کو

آگے بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ تیرے ربّ (کے قانونِ نشوونما) کی بخششِ عام کسی پر بند نہیں ہوتی۔

ان کوششوں میں ہر قوم اپنی اپنی جدّوجُہد کے مطابق آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ **اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ** (۲۱ : ۱۷)۔ تاریخی نظائر پر غور کرو اور دیکھو کہ ہمارا یہ قانون، معاشی کارگاہ میں کس طرح مختلف قوموں کو ایک دوسرے سے بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ لیکن آخر الامر ہوتا یہ ہے کہ صرف حال کی خوشگواریاں چاہنے والے مِٹ جاتے ہیں اور مستقبل کی مرفّہ الحالیوں کے طالب بلند مدراج حاصل کر لیتے ہیں۔ **وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا** (۲۱ : ۱۷)۔ مستقبل کے درجات اور معاشی خوش حالیاں سب سے بڑھ کر ہیں اور مستقبل صرف اسی کے لئے ہوتا ہے جو معاشی زندگی کو وحی کے ابدی قوانین (مستقل اقدار) کے تابع رکھے۔ لیکن جو قوم دنیا کے لئے کوئی الگ خدا تجویز کر لے (یعنی قریبی مفاد کے لئے اور قوانین وضع کرے) اور آخرت کے لئے اور قوانین سامنے رکھے، تو یہ وہ شرک ہے جس کا نتیجہ بدحالی اور درماندگی کے سوا کچھ نہیں۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ۝

(۲۲ : ۱۷)

اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود (سرچشمۂ قانون) نہ ٹھہراؤ ورنہ ایسے ہو رہو گے کہ ہر طرف سے نفرین کے مستحق اور ہر طرف سے درماندگی میں پڑے ہوئے۔

اس سے ایک تیسرا گروہ سامنے آگیا۔

تیسرا گروہ گروہِ اوّل --- وہ لوگ جو اپنے حال کی زندگی ہی کو زندگی سمجھتے ہیں، مستقبل پر نگاہ نہیں رکھتے۔ انہوں نے اپنے حال کی زندگی کی کامیابیوں کیلئے تدابیر وضع کر رکھی ہیں اور وہ ان تدابیر پر عمل کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان سے، انہیں پیش پا اُفتادہ مفاد حاصل ہوتے جاتے ہیں۔ اس گروہ کو کفّار کا گروہ کہہ لیجئے، یعنی جو مستقبل (آخرت) کا منکر ہے۔

گروہِ ثانی --- وہ گروہ ہے جو حال اور مستقبل (دنیا و آخرت) دونوں کو سامنے رکھتا ہے۔ اس کے لئے اس کے پاس ایک ضابطۂ حیات ہے جو حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) میں کوئی حدِّ فاصل قائم نہیں کرتا --- حال اور مستقبل دونوں روشن اور تابناک ہوتے ہیں (**فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً**) ۔ اس گروہ کو قرآن مومنین کی جماعت کہتا ہے۔ ان کے پیشِ نظر تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت ہوتی ہے جسے وہ قرآن کے متعیّن کردہ پروگرام کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اور تیسرا گروہ وہ ہے جو حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) کو دو الگ الگ دنیائیں قرار دیتا ہے۔

وہ سمجھتا ہے کہ کچھ کوششیں ایسی ہیں جو صرف دنیا کی کامیابی عطا کرتی ہیں اور کچھ ایسی جو "عاقبت" سنوارتی ہیں۔ اس کے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ جس کی عاقبت سنور رہی ہو، اس کی دنیاوی زندگی بھی کامیاب ہو، بلکہ اس کے برعکس، وہ یہ سمجھتا ہے کہ آخرت اسی کی کامیاب ہوتی ہے جس کی دنیاوی زندگی نامراد و ناکام ہو۔ وہ انسان کی دنیاوی زندگی

اور آخرت کی زندگی کو دو الگ الگ زندگیاں سمجھتا ہے، جن کا ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ یعنی اس کے نزدیک دنیاوی زندگی کی خوشحالیوں اور ناداریوں کیلئے کسی اور خدا کا قانون کارفرما ہے اور اُخروی کامیابیوں اور شادکامیوں کیلئے کسی اور کا۔ وہ ان دونوں کے لئے قانون کا سرچشمہ ایک نہیں سمجھتا۔ وہ ہر دو دوائر میں الگ الگ "خداؤں" کا قانون رائج سمجھتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس قسم کا انسان جو دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر سفر کرتا ہے، ڈوب کر رہے گا۔ جو شخص درخت کی جڑ میں آگ لگائے اور پتوں پر پانی چھڑکے، اس کی کوششوں کا نتیجہ ظاہر ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ انسانی جسم کے ایک حصّے کا خون صالح ہو سکتا ہے اور دوسرے حصے کا فاسد۔ اس کا ایمان ہے کہ پودے کی اوّلین کونپل مُرجھا کر خشک ہوتی ہے تو ہونے دیجئے، کچھ پرواہ نہیں۔ آخرالامر خوشے دانوں سے بھرے ملیں گے۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک کونپل کے لئے الگ قانون ہے اور ڈنٹھل اور خوشوں کے لئے الگ قانون۔ قرآن کہتا ہے کہ جو شخص (یا قوم) حیاتِ کائنات سے متعلّقہ قانونی وحدت (Unity of Law) کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے، اسے کہہ دیجئے کہ اس کا حال بھی بدحال ہو گا اور مستقبل بھی تاریک۔ غور کیجئے قرآن اس باب میں کس قدر اُبھرے ہوئے الفاظ میں اس حقیقت کو واشگاف کرتا ہے، جب وہ کہتا ہے:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ

(۲ : ۸۵)

"کیا تم قانونِ کائنات کے ایک حصّے پر ایمان لاتے ہو

اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو؟"

جو ایسا کرتا ہے:

فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ

(۲:۸۵)

جو تم میں ایسا کرے گا' اس کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ اس کیلئے دنیاوی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی ہوگی اور قیامت کے دن وہ سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

وہ اس نہجِ زندگی کا نام " **کفر بعد الاسلام** (۹:۷۴) قرار دیتا ہے اور ایسے لوگوں کے حال اور مستقبل دونوں کو تاریک بتاتا ہے۔ **عَذَابًا اَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ** (۹:۷۴) اور واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ دنیاوی زندگی میں ان کا کوئی پرسانِ حال اور مددگار نہیں ہوتا۔

وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ

(۹:۷۴)

☆

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ قرآن کی رُو سے' ایک گروہ وہ ہے جس کی حال کی زندگی کامیابی اور کامرانی کی زندگی ہوتی ہے لیکن اس کا مستقبل تاریک ہوتا ہے۔

ایک گروہ وہ ہے جس کا حال اور مستقبل دونوں روشن ہوتے ہیں۔

تیسرا گروہ وہ ہے جس کا حال اور مستقبل دونوں تاریک ہوتے ہیں۔ اس کے نزدیک ایسا گروہ کوئی نہیں ہو سکتا جس کا حال تو تاریک ہو اور مستقبل روشن۔ وہ کہتا ہے کہ جس کا حال تاریک ہے، اس کا مستقبل بہرحال، تاریک ہوتا ہے: **مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى** (۱۷ : ۷۲) جو یہاں اندھا ہے وہ وہاں بھی اندھا ہوگا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کسی کی دنیاوی زندگی ذلّت و خواری میں گزرے اور عاقبت سنور رہی ہو۔ جو ایسا کہتا ہے وہ حال اور مستقبل کی نشوونما کے لئے الگ الگ خداؤں کا قانون بنانا چاہتا ہے۔ یہ شرک ہے توحید نہیں، ایک خدا پر ایمان نہیں۔ جماعتِ مومنین کی اس دنیا کی زندگی عزّت اور قوت، غلبہ و حکومت، سرفرازی و سربلندی کی زندگی ہوتی ہے۔ اگر ان کی زندگی ایسی نہیں، تو ان کی آخرت کی زندگی بھی خوشگواریوں کی زندگی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی قوم کو اس دنیا میں دولت اور حکومت حاصل ہو، لیکن اس کی آخرت کی زندگی تباہ و برباد ہو لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی قوم کی دنیاوی زندگی ذلّت و خواری کی زندگی ہو اور اس کی عاقبت درخشندہ و تابناک ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج جگر سوز و خود افروز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

س مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ کسی قوم کا کسی وقت، محض ہنگامی

طور پر گر جانا اور بات ہے اور اس کا اس زوال اور انحطاط پر یہ کہہ کر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا اور بات، کہ کوئی بات نہیں اگر ہمیں دنیا میں عزّت و حکومت حاصل نہیں تو نہ سہی، آخرت میں جنّت کے حق دار تو ہمیں ہوں گے۔ یہ اُن کی بھول ہے۔

زندگی کے ٹکڑے قرآن آیا تو اس نے دیکھا کہ ساری دنیا نے حیاتِ انسانی کو طول اور عرض دونوں سمتوں میں بُری طرح ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا ہے۔ طول میں یوں کہ اس نے دنیا اور آخرت کو الگ الگ دنیائیں تصوّر کر رکھا ہے۔ دنیا اربابِ حکومت کے سپرد ہے جو حال کو کامیاب بنانے کے مدّعی ہیں۔ آخرت اربابِ مذہب کے قبضہ میں ہے جو لوگوں کی عاقبت سنوارنے کے دعویدار ہیں۔ عرض کی سمت دیکھا تو ہر فرد اپنے آپ کو الگ حیات کا پیکر سمجھتا ہے اور اگر زندگی کی بعض ضروریات کے تقاضے بعض انسانوں کو ایک جگہ جمع بھی کر دیتے ہیں(جنہیں شعوب و قبائل و اقوام کہا جاتا ہے) تو وہ اپنے اپنے مفاد کی فکر کرتے ہیں۔ عالم گیر انسانیت کا مفاد ان کے پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ یہ تھی ساری دنیا کی حالت نزولِ قرآن کے وقت۔ وہ حالت جسے اس نے **فساد فی البر والبحر** (۳۰ : ۴۱) کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور شرک کہہ کر پکارا ہے۔

قرآن نے کہا کہ حیات کی اس طرح تقسیم، نفسِ واقعہ (Facts) کے خلاف ہے۔ حیاتِ انسانی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت (Indivisible Unit) ہے۔ وہ نہ طول کی طرف بٹ سکتی ہے نہ عرض کی سمت۔ طول کی سمت یہ

ایک جوئے رواں ہے جو اس دنیا سے بڑھتی ہوئے آخرت تک مسلسل چلی جاتی ہے۔ زمان (Time) کی صراطِ مستقیم پر مختلف نشانات صرف گز پر گرہوں کے نشانات ہیں اور بس' اس لئے دنیا اور آخرت کی تمیز نفسِ واقعہ کے خلاف ہے۔ لہٰذا جب حقیقت حال یہ ہے' تو یہ روش یکسر باطل ہے کہ حال کے متعلق اربابِ حکومت کے قوانین نافذالعمل ہوں اور مستقبل کے متعلّق پیشوایانِ مذہب کے آئین و وساتیر۔ دوسری جانب عرض کی سمت آیئے تو مختلف افراد ایک "نفسِ حیات" کے مظاہر ہیں۔ اسی طرح جیسے پنکھے، قمقمے، مشینیں سب بجلی کی ایک لہر (Electric Current) کے حرکیاتی مظاہر ہوتے ہیں۔ اس لئے افراد' شعوب' قبائل و اقوام کی تقسیم بھی غیر فطری ہے۔

دین کیا ہے؟ تمام انسان ایک خاندان کے افراد' ایک درخت کے پتے اور ایک سمندر کے قطرے ہیں' جن کی اصل بنیاد (Base) ایک ہے۔ یہ تھی وہ عظیم القدر حقیقت (یعنی وحدتِ خالق سے وحدتِ مخلوق اور وحدتِ قانون کا تصور) جسے قرآن نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس نے اس حقیقت کو بطور ایک نظریہ ہی کے پیش نہیں کیا' بلکہ یہ بھی بتادیا کہ انسانی نظامِ تمدن و معاشرت میں اس وحدتِ حیات کا عملی مظاہرہ کس طرح ہوگا۔ یہ عملی طریق جس سے یہ عظیم المرتبت حقیقت ایک زندہ پیکر کی صورت میں سامنے آجاتی ہے' دین کہلاتا ہے۔ لہٰذا' دین نام تھا اس طریقِ عمل کا جس سے ایک طرف حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) ایک غیر منقسم وحدت بن جاتے ہیں اور دوسری طرف تمام افرادِ نوعِ انسانی ایک عالمگیر

برادری کے ایسے اجزاء جیسے سمندر کے قطرات۔ دین کے ارکان و مناسک اسی غیر مرئی حقیقت کو محسوس و مشہود شکل میں لانے کے ذرائع و اسباب تھے جن سے اس نظامِ زندگی کو عملاً متشکل ہونا تھا' جسے اس نے الدّین کہہ کر پکارا ہے۔ دین کے اس نظام کی خصوصیت یہ تھی (یا یوں کہئے کہ اس کا فطری نتیجہ یہ تھا) کہ تمام اقتدار انسانوں کے ہاتھوں سے چھن کر اُس قانون کے ہاتھ میں آگیا جو اپنی اصل کے اعتبار سے انسانوں کا خود ساختہ نہ تھا بلکہ وہاں سے ملا تھا جو ہدایت کا سرچشمہ ہے اور جسے خدا کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں اطاعت فقط قانونِ خداوندی کی تھی اور قانون کی اطاعت بھی غلام کی سی بالجبر اطاعت نہیں' بلکہ اس طرح کہ انسان ان قوانین پر پورے غورو فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ وہ واقعی اس کی دنیاوی اور اُخروی زندگی کو خوشگوار اور تابناک بنانے کا ذریعہ ہیں اور اس طرح دل اور دماغ کی پوری رضا مندی کے بعد ان پر عمل کرنا شروع کر دے۔ "**اطاعت**" کے معنی ہی ایسی پابندی ہے جسے انسان' بطیبِ خاطر' اپنے اُوپر عاید کرے۔ اس طرح دین کے نظام میں اقتدار کسی کے ہاتھ میں نہ رہا اور جب اقتدار کسی کے ہاتھ میں نہ رہا تو زندگی کی ناہمواریاں بھی ناپید ہوگئیں۔ اس نظام کے حلقہ میں بسنے والی تمام جماعت کی زندگی کا نصب العین تھا انسانیت کے مستقبل کی درخشندگی' تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت (پرورش)۔ اس کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ ان کا حال خود بخود روشن ہوگیا۔ اس لئے کہ' جیسا کہ ہم اُوپر دیکھ چکے ہیں' یہ فطرت کا اٹل قانون ہے کہ جس کا مستقبل روشن ہو' اس کا حال ضرور تابناک ہوتا ہے۔ دیکھئے قرآن نے کیسی وضاحت سے اس

قانون کو بیان کیا ہے۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (۵۱ : ۴۰)

> "ہم اپنے رسولوں اور جماعتِ مومنین کی حال کی زندگی کو بھی کامیاب بناتے ہیں اور مستقبل کی زندگی کو بھی، جب نتائج خود کھڑے ہو کر پکار اُٹھیں گے"۔

یہ نہیں کہ یہ نصرت یونہی اتفاقیہ عمل میں آجاتی ہے، بلکہ فرمایا کہ **كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ** (۴۷ : ۳۰) "ہم پر مومنین کی نصرت فرض ہے"۔ غور کیجئے، قانونِ خداوندی کی ہمہ گیری اور محکمیت کس قدر واضح انداز سے بیان کی گئی ہے۔ دوسری جگہ اس جماعت کو مخاطب کر کے فرمایا کہ **نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ** (۳۱ : ۴۱) "دنیا کی زندگی اور آخرت دونوں میں تمہارے پُشت پناہ ہیں"۔

قرآن نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ اس نظام میں جو مستقبل کی خوشحالیوں کا ضامن ہو، ابتداءً محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے اور نتائج نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس، مفادِ عاجلہ والے تھوڑی سی کوشش سے محسوس نتائج سامنے لے آتے ہیں۔ لیکن گھبراؤ نہیں، مفادِ عاجلہ والے تم پر کبھی غالب نہیں آسکیں گے **وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا** (۱۴۱ : ۴) "ایسا ہو نہیں سکتا کہ خدا کا قانون مستقبل پر ایمان رکھنے والے مومنین پر ان لوگوں کو غلبہ دے دے جو صرف مفادِ

عاجلہ کو سامنے رکھتے ہیں"۔ یہ لوگ اپنے سامنے مفادِ عاجلہ کے ڈھیر دیکھ کر یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ زندگی کی دوڑ میں آگے نکل گئے اور جنہوں نے مستقبل کو سامنے رکھا وہ بچھڑ گئے۔ ان کا یہ گمان غلط ہے۔ بیج بونے والا کسان کبھی اس کے مقابلے میں ناکام نہیں رہ سکتا جس نے اپنے بیج کے دانوں کو پسوا کر روٹی پکالی۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا ۚ إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ ○

(۸ : ۵۹)

"مفادِ عاجلہ والے یہ گمان نہ کرلیں کہ یہ آگے نکل گئے۔ بالکل نہیں' یہ کبھی دوسرے گروہ پر بالادست نہیں ہوسکتے"۔

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (۷ : ۱۲۸) انجام کار غلبہ اُنہیں کا رہے گا جو قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔ کفّار (مفادِ عاجلہ والوں) کا مومنین پر غلبہ پانا تو ایک طرف' یہ ان کے برابر بھی نہیں ہوسکتے۔

أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۚ لَا يَسْتَوُونَ ○

(۳۲ : ۱۸)۔

"کیا مومن اور فاسق دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہوسکتے"۔

پھر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ دنیا کی زندگی میں تو "کفّار اور فاسقین" بڑھے ہوئے ہوں گے اور مومنین کا غلبہ صرف حیاتِ اُخروی میں ہوگا۔ اُن کا حال درخشندہ ہوگا اور ان کا مستقبل۔ قرآن

نے اسے بالکل واضح کردیا کہ یہ غلبہ و تسلط اسی دنیا میں ہوگا۔

> اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِى الْاَرْضِ ۡ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۝ (۳۸:۲۸)۔
>
> "کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم اس دنیا میں (**فی الارض**) ان کو جو ایمان لائے اور انہوں نے صلاحیت بخش کام کئے، ان کے برابر کردیں گے جنہوں نے فساد برپا کرنے والے کام کئے؟ کیا ہم حال اور مستقبل میں ہم آہنگی پیدا کرنے والوں کو اُن کے برابر کردیں گے جو اِن دونوں میں تفریق کرتے ہیں (**فُجّار**)؟ یہ حقیقت ہے کہ ایمان بالآخرت کا فطری نتیجہ عاقبت بینی اور مآل اندیشی ہے۔ لہٰذا جو قوم عاقبت اندیش ہو اس کا مقابلہ وہ لوگ کیسے کرسکتے ہیں جو دُور کی بات سوچ ہی نہیں سکیں"۔

جماعتِ مومنین قرآن کے ان تمام دعاوی (یا قوانینِ خداوندی) کی زندہ شہادت وہ نتائج تھے جو ساری دنیا کے سامنے ہیں۔ کیا اس جماعت سے بڑھ کر جسے قرآن نے مومنین کہہ کر پکارا ہے کسی اور جماعت کی آخرت بھی سنوری ہوئی ہو سکتی ہے؟ اور کیا اس جماعت سے بڑھ کر کسی اور جماعت کی دنیا بھی زیادہ کامیاب تھی؟ ان کی حکومت اس زمین پر قائم ہوگئی تھی۔ **لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ** (۲۴:۵۵)۔ انہوں نے اپنی

کوششوں کو خدائی قانون سے ہم آہنگ کرلیا تھا۔ (رَضُوْاعَنْهُ (۵:۱۱۹)) اور خدائی قانون کی انقلاب آفریں قوتیں ان کی کوششوں سے ہم آہنگ ہوگئی تھیں (رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ (۵:۱۱۹))۔ نتیجہ دنیا کے سامنے ہے۔

اسلام کی اس سب سے پہلی داعی جماعت نے جو کچھ کرکے دکھایا وہ یونہی ہنگامی واقعہ یا اتفاقی حادثہ نہیں تھا' بلکہ قانونِ فطرت کا اٹل نتیجہ تھا۔ جس طرح سائنس کے اصول کے مطابق کسی معمل (Laboratory) میں مختلف اجزاء کے کیمیائی تجزیہ اور امتزاج (Chemical Analysis & Synthesis) سے متعین نتائج سامنے آجاتے ہیں' اسی طرح انسانی حیاتِ اجتماعیہ میں قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی و توافق سے بھی اٹل نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ انہی اٹل نتائج کا نام **استخلاف فی الارض** تھا جس میں انسانی زندگی کو پورا پورا توازن نصیب ہوگیا تھا اور اس لئے ان میں حسن ہی حسن جھلک رہا تھا۔ اس میں حیات' طول اور عرض دونوں میں اپنی وحدت قائم کئے ہوئے تھی۔ نہ آخرت دنیا سے الگ تھی' نہ انسانیت ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اس جماعت نے اپنے زمانے کی سطح کے مطابق' تسخیرِ فطرت سے کائنات میں بکھری ہوئی قوتیں اپنے قبضہ میں کی ہوئی تھیں اور ماحصلِ فطرت (متاعِ ارض) کو آسمانی قوانین (مستقل اقدار) کے مطابق تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس تحصیل و تقسیم کے نظام کا نام دین تھا' یعنی متاعِ ارضی (دنیاوی اسبابِ زیست) کے حصول کے لئے ہر فرد کی اپنی اپنی بساط کے مطابق' پوری پوری جدوجہد اور کامل سعی و کاوش اور اس کے

ماحصل، متاعِ ارضی کی تقسیم اس انداز سے کہ ہر فرد کو اس کی امکانی قوتوں (Potentialities) کے نشوونما پانے (Fully Developed) ہونے کے لئے پورے پورے اور یکساں مواقع میسّر ہوں۔ ان کا نام قرآنی نظامِ ربوبیت تھا یعنی افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے سامان فراہم کرنا تاکہ ان کی دنیا اور آخرت دونوں کی زندگی روشن ہو جائے۔

یہ تھا دین، جس میں نہ ملوکیت کا استبداد تھا نہ مذہبی پیشوائیت کی سیاست، نہ طبقات کی تقسیم تھی نہ بساطِ زندگی کی ناہمواریاں، نہ دنیا آخرت سے الگ تھی نہ حال مستقبل سے جدا۔

اس کے بعد اب، اس کے بعد تاریخ کا ایک ورق اور اُلٹیے اور ایک عجیب تماشا دیکھئے۔ وہی قوم تھی اور ان کے ہاتھوں میں وہی قرآن، لیکن اب ایک طرف ملوکیت اپنے جبروت و اقتدار کے ساتھ مسلّط تھی اور دوسری طرف مذہبی پیشوائیت اپنے کامل تقدّس اور طمطراق کے ساتھ مستولی۔ انسانیت طبقات میں بٹ چکی تھی اور قدم قدم پر وہ ناہمواریاں سدّ راہ تھیں جو نظامِ سرمایہ داری کا فطری نتیجہ ہوتی ہیں۔

اس مقام پر فطرۃ" یہ سوال پیدا ہوگا کہ اگر وہ نظام، انسانی زندگی کی برُومندی کا ضامن اور اس کی نشوونما کا کفیل تھا تو وہ مسلسل آگے کیوں نہ بڑھتا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد، اس کی جگہ پھر وہی غیر فطری نظام کہن کیوں مسلّط ہو گیا؟

میں اس سوال کا جواب متعدّد بار دے چکا ہوں[1]۔ اس لئے اس وقت اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ آپ سرِدست صرف اتنا دیکھئے کہ دین کے جس نظام کی طرف اُوپر اشارہ کیا گیا ہے‘ وہ نظام انسانی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کا ضامن ہوسکتا ہے یا نہیں۔ اگر آپ اس نظام کی کفایت کو تسلیم کرتے ہیں‘ تو سرِدست اس بحث میں نہ جایئے کہ وہ مستقل طور پر قائم کیوں نہیں رہا۔ دیکھئے صرف یہ کہ اسی نظام کو پھر سے قائم کرلیا جایئے تو انسانیت جگمگا اُٹھے گی یا نہیں؟ یوں بھی اس وقت میرے مخاطب وہ لوگ ہیں (یعنی مسلمان) جنہیں یہ تسلیم ہے کہ اس نظام میں اس کی صلاحیت موجود ہے کہ وہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی تمام ناہمواریوں کو مٹا کر‘ کاروانِ زندگی کو پھر سے متوازن و ہموار راہوں پر لے چلے۔ لہٰذا ہمیں اس وقت‘ اس بحث میں اُلجھنے کی بجائے (کہ یہ نظام آگے کیوں نہ چلا) صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ ملّتِ اسلامیہ (یعنی موجودہ مسلمان) جس ذلّت کی زندگی بسر کر رہی ہے‘ اس ذلّت کے اسباب کیا ہیں اور اس کی اصلاح کی صورتیں کیا ہیں؟

بہرحال‘ یہ آپ نے دیکھ لیا کہ دین کے نظام میں بادشاہت (ملوکیت) کا کہیں نام تک نہیں تھا اور مذہبی پیشوائیت کو کوئی جانتا نہ تھا۔ اب ہم تاریخ کے جس دور میں پہنچے ہیں وہاں ملوکیت بھی موجود تھی اور مذہبی پیشوائیت (Priesthood) بھی۔

---

[1] اس کی تفصیل میرے ایک مبسوط مقالہ (اسلام آگے کیوں نہ چلا) میں ملے گی جو "سلیم کے نام خطوط" میں شائع ہو چکا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ دین کی رُو سے حیات کی وحدت غیر منقطع ہوتی ہے اس لئے اس میں حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) میں کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ ایک ہی قانون ہے جو پوری کی پوری غیر منقسم حیات پر حاوی ہوتا ہے۔ ملوکیت[1] سے مراد یہ ہے کہ دنیاوی امور کے لئے قانون کا سرچشمہ الگ تصوّر کرلیا جائے۔ جب آپ حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) کا تصوّر تو رکھتے ہوں لیکن دنیاوی اصولوں کے لئے قانون کا سرچشمہ الگ تجویز کرلیں تو لامحالہ آپ کو آخرت کے لئے بھی ایک جداگانہ ضابطہ کی ضرورت پڑے گی۔ وہ ضابطہ جو صرف آخرت کے متعلق ہو اور دنیا کے ساتھ اس کا کچھ واسطہ نہ ہو' مذہب[2] کہلاتا ہے۔ لہٰذا ملوکیت اور مذہب'

---

[1] قرآن کی رُو سے ملوکیت صرف یہی نہیں کہ باپ کے بعد بیٹا وارثِ تخت و تاج ہو جاتا ہے۔ ملوکیت ہر اس نظام کا نام ہے جس میں دنیاوی امور کے لئے قانون کا سرچشمہ قرآن سے الگ ہو' خواہ اس کی شکل بادشاہت کی ہو یا جمہوریت کی۔ یہ الگ بات ہے کہ دین کے نظام میں وراثتِ اقتدار کا تصوّر یکسر باطل ہوتا ہے کیونکہ جب کسی انسان کا اقتدار ہی نہیں ہو سکتا تو وراثت کیسی؟

[2] میں “مذہب” اور “دین” کے الفاظ الگ الگ استعمال کر رہا ہوں۔ قرآن مذہب نہیں لایا تھا حتیٰ کہ ..... “مذہب” کا لفظ بھی غیر قرآنی ہے۔ سارے قرآن میں یہ لفظ کہیں نہیں آیا۔ وہاں صرف دین کا ذکر ہے۔ وہ دین لایا تھا۔ مذہب اس وقت پیدا ہوا جب نظامِ دین مفقود ہو گیا۔ لہٰذا میری تحریروں میں جہاں “مذہب” کا لفظ

(باقی اگلے صفحہ کے نیچے دیکھیں)

وحدتِ حیات کے ٹوٹنے کے بعد لازم و ملزوم طور پر وجود میں آجاتے ہیں۔ جس طرح پانی کے قطرہ کا تجزیہ کیا جائے تو ہائیڈروجن اور آکسیجن جدا گانہ اور متمیز تشخّص کے ساتھ وجود میں آجاتی ہے۔

اس مقام پر اس حقیقت کو اچھی طرح سے سمجھ لیجئے کہ میں نے "مذہب" کا لفظ کن معنوں میں استعمال کیا ہے اور "دین" سے مفہوم کیا ہے۔ مذہب سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اس دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی سے الگ کرکے' اس زندگی کو اربابِ سیاست کے سپرد کردے اور آخرت کی زندگی کو اربابِ شریعت کے حوالے کردے' یعنی خدا کی دنیا الگ ہو اور قیصر کی الگ۔ بادشاہ (یا حکومت) اپنا ٹیکس وصول کرے اور مذہبی پیشوا اپنا خراج۔ حکومت کے قوانین کی خلاف ورزی جرم کہلائے اور شریعت کے احکام کی خلاف ورزی سے گناہ لازم آئے۔ جرم کی سزا اسی دنیا میں مل جائے اور گناہ کی سزا اگلی دنیا میں جا کر ملے۔ اسی طرح دنیاوی حکمرانوں کی خوشنودی کے انعامات یہاں ملیں اور خدا کی خوشنودی کی جزا جنّت میں پہنچ کر۔ یہ ہے وہ تصوّرِ زندگی جسے "مذہب" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام کا تصوّرِ حیات ہے جسے وہ دین کے نام سے پکارتا ہے۔ آئندہ صفحات میں جہاں جہاں مذہب اور دین کے الفاظ

(پچھلے صفحہ سے مسلسل)

آئے اس سے یہی مفہوم ہو گا۔ میں اسلام کو "دین" کہہ کر پکارتا ہوں (کہ قرآن نے اسے دین کہا ہے) اسے "مذہب" نہیں کہتا' کیونکہ مذہب سے مفہوم ہے

- Other Worldliness

آئیں، ان کے لئے یہ مفہوم سامنے رکھئے تاکہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو سکے۔

اب آگے بڑھئے!

مذہب اور سیاست اگر مذہب اور سیاست، امورِ دنیا اور امورِ آخرت ایک ہو جائیں اور دونوں قوانینِ خداوندی کے تابع رہیں تو دین متشکّل ہو جاتا ہے، یعنی دین میں ملوکیت اور مذہب کا الگ الگ تشخّص باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا ملوکیت اپنے قیام کے لئے ضروری سمجھتی ہے کہ مذہب اپنی جگہ پر قائم رہے اور مذہب اپنے قیام کے لئے ملوکیت کا قیام ضروری سمجھتا ہے۔ اس طرح ان دونوں میں (بظاہر تضاد کے باوجود) باہمی سمجھوتہ ہو جاتا ہے۔ کھشتری (حکومت کرنے والی قوم) برہمن کی رکھشا (حفاظت) کرتا ہے اور برہمن کھشتری کو آشیرباد (دعا) دیتا ہے۔ محراب و منبر سے بادشاہ کو **ظلّ اللہ** قرار دے کر **اَیَّدَہُ اللّٰہُ بِنَصْرِہٖ** کی آواز بلند ہوتی ہے اور تخت و تاج، مساجد و مکاتب کے لئے جاگیریں وقف کرکے مذہبی سیادت کی حفاظت کرتا ہے۔ مذہب اس کے معاوضہ میں ملوکیت کے استحکام و بقا کے لئے لوگوں کے دلوں میں یہ فریب پختہ طور پر جاگزیں کرتا رہتا ہے کہ دنیا قابلِ نفرت چیز ہے، سیاست و حکومت کے دھندے دنیاداروں کے ہیں، خدا کے نیک بندوں کو دنیاوی امور سے الگ رہنا چاہیئے، ان کا مقصود و منتہیٰ آخرت کی نجات ہے۔ جو شخص اس دنیا میں جتنا ذلیل ہوگا اتنا ہی خدا کے ہاں مقرب و مقبول ہوگا **و قس علی هذا**۔ اس فسوں سازی سے عوام کی توجہات، آخرت پر مرتکز ہوجاتی ہیں اور ملوکیت اپنی مفاد پرستیوں میں بے زمام ہوجاتی ہے۔ اب ملوکیت کے لئے کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔ مذہب کی

طرف سے لوگوں کو "صبر" (استبداد کے خلاف لب تک نہ ہلانے) کی ایسی تلقین کی جاتی ہے کہ وہ ہر جور و ستم کو خدا کی رحمت سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ ان کے سامنے مقربانِ بارگاہِ خداوندی کی ایسی تصویر کھینچی جاتی ہے کہ وہ مفلسی اور تباہ حالی کو "اللہ کے پیاروں" کی علامات قرار دینے لگ جاتے ہیں۔ یوں مذہب کی فسوں کاریوں سے، ملوکیت کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی جاتی ہیں۔

تاریخ کے قدیم ایام میں مذہب کو اپنی دسیسہ کاریوں اور ابلہ فریبیوں کے لئے زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑتی تھی۔ جب دین کے ضوابط (جو حضرات انبیاءِ کرامؑ کی وساطت سے انسانوں کو ملتے تھے) محفوظ نہیں رہتے تھے تو اربابِ مذہب کے لئے یہ آسان تھا کہ جو کچھ جی میں آئے اُسے شریعت خداوندی کہہ کر پیش کردیں۔ **يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ** (۲ : ۷۹) لیکن اسلام کے معاملہ میں صورت مختلف تھی۔ یہاں (دین) کا ضابطہ (قرآن) اپنی اصلی شکل میں موجود تھا اور اس کی حفاظت کا ذمّہ خود خدا تعالیٰ نے لے رکھا تھا۔ اس لئے اب مذہب کو اپنی فسوں کاریوں کے لئے خاص طور پر کاوش کرنی پڑی۔ ان حالات میں کامیابی کی صورت یہی ہوسکتی تھی کہ دین کے ضابطہ (قرآن) کے الفاظ اور اس نظام کے ارکان کو تو علیٰ حالہٖ قائم رہنے دیا جائے، لیکن اس کے مقصود و مفہوم کو بدل دیا جائے۔ چنانچہ اس کے لئے مذہب نے یہ عقیدہ عام کیا کہ کلامِ الٰہی (ضابطۂ دین) یعنی قرآن کریم کے الفاظ میں برکت ہے (معنوں میں نہیں الفاظ میں) انہیں صرف دہراتے رہنا چاہیے۔ اسے "تلاوتِ

قرآن" کہتے ہیں، یعنی بغیر سمجھے الفاظ کو دہراتے رہنا (حالانکہ "تلاوت" کے معنی ہی کسی کے پیچھے چلنا یعنی پیروی کرنا ہے) دیکھئے اس ایک تبدیلی سے مذہب اپنے مقصد میں کس قدر کامیاب ہوگیا۔ دین کا ضابطہ (قرآن) بھی مسلمانوں کے سامنے رہا اور انہیں قرآن سے الگ بھی کر دیا۔ مذہب نے "تلاوتِ قرآن" (یعنی بے سمجھے اس کے الفاظ کو دہراتے رہنے) کے ثواب میں ایسے ایسے سبز باغ دکھائے کہ ساری قوم اس میں اُلجھ کر رہ گئی۔ حالانکہ اسی قرآن میں ایک گروہ کے متعلق یہ مذکور ہے **يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ** (۳ : ۱۶۷) "وہ زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتا۔" بلا سمجھے الفاظ دہراتے رہنے سے بھی یہی ہوتا ہے

مذہب کے حربے

کہ انسان زبان سے وہ الفاظ ادا کرتا رہتا ہے جن کا کوئی مفہوم اس کے دل میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح قرآن میں ہے، حالتِ سکر (نشہ) میں صلاۃ کے قریب نہ جاؤ کیونکہ اس وقت جو کچھ تم زبان سے کہتے ہو اسے سمجھتے نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ صرف الفاظ دہراتے رہنے سے قرآن کا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ خدا نے قدم قدم پر (قرآن میں) غور و فکر کرنے کی تاکید کی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر قرآن کو بغیر سمجھے پڑھ لیا جائے تو غور و فکر کس پر ہوگا؟ قرآن کے الفاظ کو محفوظ اس لئے رکھا گیا تھا کہ ان کا مطلب سمجھا جائے اور مطلب اس لئے سمجھا جائے کہ اس کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ جب یہ عقیدہ پیدا ہو جائے کہ قرآن کو سمجھنے کی ضرورت نہیں، اس کے الفاظ دہرا لینے سے "ثواب" ہوجاتا ہے تو پھر اس پر عمل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ذرا آگے بڑھئے تو پھر تفاسیر کے ذریعہ ان تمام قرآنی اصطلاحات کو جنہیں دین نے اپنے نظام کو سمجھانے کے لئے اختیار کیا تھا، نئے معنی پہنانے شروع کر دیئے جس سے ہر بات "آخرت" سے متعلّق ہو جائے اور لوگوں کی نگاہوں میں "دنیا" ذلیل اور قابلِ نفرت شے بن جائے۔ اعمال، جزاء، سزا، حسنات، سیّئات، فلاح، خُسران، عزّت، ذلّت، سُرخروئی، رُو سیاہی سب کے سب آخرت پر اُٹھا کر رکھ دیئے گئے۔

اب آئی "دین" کے ان ارکان کی باری جو اس نے اپنے نظام کے قیام کے لئے تجویز کئے تھے۔ کلمہ، صلاۃ، صیام، زکاۃ، حج، یہ سب ذرائع تھے نظامِ دین کے قیام و استحکام کے۔ مذہب نے انہیں رسوم بنا کر مقصود بالذّات قرار دے دیا، یعنی یہ اعمال کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں، بلکہ ان کی رسمی ادائیگی ہی مقصود ہے اور بس۔

جن لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس طرح قرآن کے الفاظ دہرانے یا ارکانِ اسلام ادا کرنے سے حاصل کیا ہوتا ہے، ان کی تسلّی کے لئے کہہ دیا کہ ان سے ثواب حاصل ہوتا ہے اور یہ ملے گا آخرت میں جا کر۔

ثواب کا لفظ جس طرح مذہب میں استعمال ہوتا ہے، ایسا مُبہم ہے کہ اس کا کوئی متعیّن مفہوم کسی کے ذہن میں نہیں ہوتا۔ جہاں کوئی بات سمجھائی نہ جا سکے وہاں کہہ دیا جاتا ہے کہ اس سے ثواب[1] ہوتا ہے۔ آپ

---

[1] "ثواب" کے قرآنی مفہوم کے لئے دیکھئے میرا مضمون "ثواب" جو میرے مجموعۂ

باقی اگلے صفحہ کے نیچے دیکھیں

کہنے والے سے کہیے کہ صاحب! "ثواب" عربی زبان کا لفظ ہے، اس کی جگہ اپنی زبان کا کوئی لفظ ارشاد فرما دیجئے تاکہ بات واضح ہو جائے! آپ دیکھیں گے کہ اس کے بعد وہ آگے چل ہی نہیں سکے گا۔ اس لئے کہ مذہب کا سارا نظام ابہام (Vagueness) پر قائم ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے ہاں ثواب کا تصوّر بھی مبُہم ہے۔ اس سے کوئی ٹھوس حقیقت یا مشہود نتیجہ سامنے نہیں آتا۔

دین کی ساری عمارت، خدا کے صحیح تصوّر پر اُٹھتی ہے۔ قرآنِ کریم نے خدا کا ایسا صحیح، بلند، منزّہ اور مکمل تصوّر دیا ہے جس سے انسانی زندگی کے سارے گوشے منوّر ہوجاتے ہیں لیکن اس دور میں جس کا ذکر اوپر سے چلا آرہا ہے خدا کے اس تصوّر کو بھی بدل دیا گیا اور اس کی جگہ انسانی ذہن کے خود ساختہ تصوّر نے لے لی۔ اس تصوّر کی رُو سے یہ کہہ دیا گیا کہ خدا

(پچھلے صفحہ سے مسلسل)

مضامین "سلسبیل" میں شامل ہے۔ اس وقت اتنا سمجھ لیجئے کہ قرآن نے جماعتِ مومنین کے لئے فرمایا فَآتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا (۳ : ۱۴۷) یعنی اللہ انہیں "دنیا میں ثواب" (یا دنیا کا ثواب) بھی عطا کرتا ہے۔ لہٰذا ثواب کوئی ایسی شے نہیں جس کا تعلق اس دنیا سے نہ ہو یا وہ ایسی غیر محسوس شے ہو کہ انسان کو پتہ ہی نہ چلے کہ اسے ثواب ملا ہے یا نہیں۔ ثواب قرآنی پروگرام پر عمل کرنے کا وہ نتیجہ ہے جو محسوس شکل میں اس دنیا میں سامنے آجاتا ہے اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔ اس لئے جہاں تک اس دنیا میں ثواب کا تعلق ہے اس کا مفہوم متعیّن طور پر سامنے آجانا چاہیے۔

(معاذ اللہ) ایک مستبد حاکم کی طرح آسمانوں میں بیٹھا ہے اور چاہتا ہے کہ ہم اس کی "پرستش" کرتے رہیں۔ دین یہ کہنے کے لئے آیا تھا کہ قوانینِ الٰہیہ کے مطابق معاشرہ قائم کرو اور اپنی زندگی انہیں قوانین کے تابع بسر کرو۔ اس کا نام تھا عبادت۔ "خدا کی عبادت" کے معنی ہیں خدا کے احکام کی اطاعت، قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا، زندگی کے قدم قدم پر یہ دیکھنا کہ اس باب میں خدا کا قانون کیا کہتا ہے۔ اس سے انسان چوبیس گھنٹے "خدا کی عبادت" میں مصروف رہتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے اپنے نظام کے قیام و استحکام کے سلسلہ میں روزوں جیسا ضبطِ خویش کا پروگرام اور صلاۃ اور حج جیسے پروگرام مقرر کئے ہیں۔ ان اجتماعات سے مقصود یہ ہے کہ افرادِ ملّت قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھ کر اپنی اجتماعی زندگی کے مسائل اور انسانیت کی نجات و سعادت کی راہوں کے متعلّق غور و فکر کریں۔ جب انسان ان قوانینِ خداوندی کی عظمت پر غور کرتا ہے تو ان کے لئے احترام کے جذبے سے اس کا سر خود بخود خدا کے حضور جھک جاتا ہے۔ صلاۃ کے اجتماعات میں رکوع و سجود اسی احترام کے اظہار کی محسوس شکلیں ہیں اور یہ بھی عبادتِ خداوندی کا ایک جزو ہیں۔ لیکن اگر ان اجتماعات میں یہ بنیادی مقصد باقی نہ رہے اور صرف چند رسوم کی ادائیگی کو مقصود سمجھ لیا جائے تو اس کا نام عبادت نہیں، بلکہ "پرستش" ہوگا۔ ہم نے پرستش کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔

عوام ملوکیت کا استبداد اپنے سامنے دیکھتے تھے۔ مذہب کو اندیشہ تھا کہ کہیں اس سے ان کے دل میں ملوکیت کی مخالفت کا احساس نہ اُبھر

آئے۔ اس کی پیش بندی کے لئے اس نے یہ عقیدہ پیدا کردیا کہ دنیا میں سب کچھ خدا کے حکم سے ہوتا ہے' کوئی انسان اپنے اختیار سے کچھ نہیں کرسکتا۔ ان بادشاہوں کی کیا مجال ہے کہ یہ اپنی مرضی سے کچھ کرسکیں۔ یہ ہمارے سامنے یوں ہی اکڑتے ہیں۔ اللہ کے سامنے ان کی کیا حقیقت ہے۔ اس لئے ان کا کیا مقدور ہے کہ یہ اس کے حکم کے خلاف کچھ کرسکیں۔ لہٰذا جو کچھ ان کی طرف سے ہوتا ہے سب مشیتِ ایزدی کی طرف سے ہوتا ہے۔ "خدا شناس" کو یہ زیبا نہیں کہ وہ تیر کو دیکھے۔ اسے ہر وقت نگاہ تیر انداز پر رکھنی چاہیے۔ اس عقیدۂ تقدیر نے ملوکیت کی گرفت کو فولادی بنادیا۔ اب ان کی ہر شیطنت' خدا کی مشیت کا مظہر قرار پاگئی جس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔

ایک بنیادی تبدیلی جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے' مذہب انفرادی چیز ہے اور دین اجتماعی نظام کا نام ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مذہب میں ہر شخص اپنے اپنے طور پر مذہبی احکام اور رسوم پر عمل کرتا ہے۔ لیکن دین میں انسان کی پوری زندگی ایک اجتماعی نظام کے تابع بسر ہوتی ہے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں اسے "مملکت" کہتے ہیں۔ یعنی دین پر عمل کرنے کے لئے ایک آزاد مملکت کی ضرورت ہے جس میں دین کے قوانین نافذ ہوں۔ اس قسم کی مملکت سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے قائم فرمائی تھی جس میں اجتماعی حیثیت سے قرآنِ کریم کے احکام اور قوانین نافذ ہوتے تھے۔ قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ اس میں بجز چند احکام کے باقی تمام امور کے متعلق اصول دیئے گئے ہیں جن کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے جزئی احکام د

قوانین اسلامی مملکت مرتب کرتی ہے۔ یہ اصول ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہتے ہیں اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ جزئی قوانین زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ نبیٔ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں دین کا یہ نقشہ عملاً قائم تھا۔ حضورؐ کی وفات کے بعد بھی یہی نقشہ قائم رہا۔ اسے خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت کہا جاتا ہے۔ اس میں ”خدا اور رسولؐ کی اطاعت“ اپنے اپنے طور پر نہیں ہوتی تھی، بلکہ مرکزِ ملّت (یعنی خلافتِ راشدہ) کی طرف سے جو احکام اور ہدایات نافذ ہوتی تھیں، ان پر عمل کرنے کا نام ”اطاعتِ خدا اور رسولؐ“ تھا۔ اس تمام دوران میں قرآن کریم کے علاوہ مملکت کا کوئی اور ضابطہ نہیں تھا۔ نبیٔ اکرمؐ نے قرآنِ کریم کو اس کی مکمّل اور مرتّب شکل میں اُمّت کو دیا تھا اور اسی قرآن کی عام نشرو اشاعت خلافتِ راشدہ کے زمانے میں ہوتی تھی۔ حضورؐ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ اُمّت کو نہیں دیا تھا۔ اتنا ہی نہیں، حضورؐ نے تاکید فرما دی تھی کہ کوئی شخص قرآن کے علاوہ کوئی بات حضورؐ سے نہ لکھے۔ اگر کسی نے لکھی ہو تو اسے مٹا ڈالے (مسلم)۔ خلافتِ راشدہ میں بھی حضورؐ کی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتّب نہیں کیا گیا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں یہ سوال خاص طور پر زیرِ بحث آیا کہ حضورؐ کی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتّب کرنا چاہیے۔ اس اہم سوال پر قریب ایک ماہ تک غور و خوض ہوتا رہا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیئے کیوں کہ پہلی اُمّتوں نے جب خدا کی کتاب کے ساتھ اور چیزوں کو شامل کرلیا تو وہ تباہ ہو گئیں۔

جب خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی تو دین کا صحیح نقشہ بگڑ گیا۔

مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہوگئی۔ سیاست سے متعلق امور' حکومت نے اپنی تحویل میں رکھ لئے اور "مذہبی امور" کو آزاد چھوڑ دیا۔ مذہبی امور کا تعلق "خدا اور رسول" سے تھا اس لئے اب "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" انفرادی طور پر ہونے لگی۔

دین کے نظام میں "خدا اور رسول" کی اطاعت سے مطلب تھا اس نظام کی اطاعت جسے خدا کے احکام نافذ کرنے کے لئے رسولؐ اللہ نے سب سے پہلے قائم کیا تھا اور جسے حضورؐ کے بعد خلافتِ راشدہ کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا۔ لیکن جب دین کے نظام کی جگہ ملوکیت نے لے لی تو اب سوال یہ پیدا ہوا کہ خدا اور رسولؐ کی اطاعت کس طرح کی جائے۔ اس کے لئے پہلے تو یہ طے ہوا کہ دنیاوی معاملات میں اطاعت بادشاہ کی کی جائے اور مذہبی امور میں "خدا اور رسولؐ" کی اطاعت۔ لیکن یہاں پھر یہ الجھن پیدا ہوئی کہ خدا کی اطاعت تو خیر اس کی کتاب کی رُو سے کرلی جائے' لیکن رسولؐ کی اطاعت کس طرح کی جائے؟

بعض حضرات کے دل میں عہدِ نبیؐ اکرمؐ اور صحابہؓ کی تاریخ مرتّب کرنے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ اس کا مسالہ ان روایات سے لیا گیا جو لوگوں کی زبانی مروّج چلی آرہی تھیں۔ رسولؐ کی اطاعت کے لئے یہ سوچا گیا کہ اس تاریخ میں جو روایات نبیؐ اکرمؐ کی طرف منسوب ہیں انہیں حضورؐ کے ارشادات سمجھ لیا جائے اور ان کے مطابق عمل کرنے کو اطاعتِ رسولؐ کہا جائے۔ اس طرح حدیث کے مجموعے مرتّب ہوئے۔

روایات کے مجموعے یہ کوششیں رسولؐ اللہ کی وفات کے بہت عرصہ

بعد شروع ہوئیں۔ مثلاً ان مجموعوں میں سب سے زیادہ مستند مجموعہ امام بخاریؒ کا سمجھا جاتا ہے۔ وہ حضورؐ کی وفات سے دو اڑھائی سو سال بعد مرتّب ہوا تھا۔ (امام بخاریؒ کی وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی تھی) یہ مجموعے کسی سابقہ تحریری ریکارڈ سے مرتب نہیں ہوئے تھے، زبانی روایات جمع کی گئی تھیں۔

جو ریکارڈ اس طرح مرتّب ہو، خود اس کی حیثیت کس قدر مستند ہوسکتی ہے۔ ظاہر ہے اس کے ساتھ جھوٹی روایات وضع کرنے کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا اور یہ بہت آسان تھا۔ اگر کوئی شخص قرآنِ کریم میں ایک حرف کے اضافہ یا ردّ و بدل کرنے کی کوشش کرے تو بیک وقت لاکھوں آوازیں اس کی تردید میں اُٹھ کھڑی ہوں گی کیونکہ قرآنِ کریم کا نسخہ (جس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا تھا) ہر جگہ موجود ہوگا۔ لیکن جن باتوں کا ریکارڈ ہی کہیں موجود نہ ہو ان میں اپنی طرف سے اضافہ یا ردّ و بدل کر دینا کیا مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ وضعی روایات بننی شروع ہوئیں۔

وضعی روایات یہ کس کثرت سے بنیں، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے کہ امام بخاریؒ نے لکھا ہے کہ انہیں چھ لاکھ احادیث ملیں جن میں سے انہوں نے چھ ہزار کے قریب قابلِ قبول سمجھ کر رکھ لیں اور باقی پانچ لاکھ چورانوے ہزار کو مسترد کردیا۔ (ان چھ ہزار سے اگر مکرّرات کو حذف کردیا جائے تو ان احادیث کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہیں رہتی)۔ یہ ایک جامع احادیث کا بیان ہے۔ اسی طرح مختلف مجموعے مرتّب ہوئے۔ جو احادیث صحیح سمجھ کر ان مجموعوں میں داخل کرلی گئیں، ان کے صحیح ہونے

کی سند بھی نہ خدا نے دی تھی نہ رسولؐ اللہ نے۔ جامعین احادیث نے جن روایات کو اپنی بصیرت یا معیار کے مطابق صحیح سمجھا‘ انہیں قبول کرلیا‘ باقیوں کو مسترد کردیا۔

اگر ان روایات کے متعلق اتنا ہی سمجھا جاتا کہ یہ وہ اقوال یا اعمال ہیں جنہیں رسولؐ اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے‘ ان میں غلط بھی ہوسکتی ہیں اور صحیح بھی اور غلط اور صحیح کا معیار یہ مقرر کیا جاتا کہ ان میں سے جو روایت قرآنِ کریم کے خلاف جاتی ہو وہ صحیح نہیں ہوسکتی‘ کیونکہ رسولؐ اللہ کا کوئی ارشادِ گرامی یا عملِ مبارک قرآن کے خلاف نہیں ہوسکتا‘ تو بھی خیر تھی لیکن ان کے متعلق عقیدہ یہ قائم کیا گیا کہ :۔

روایات کے متعلق عقیدہ

(i) یہ مثلہ‘ معہ‘ ----- قرآن کے ساتھ‘ قرآن کی مثل ہیں۔

(ii) یہ خدا کی وحی ہیں جنہیں جبرائیل امین اسی طرح لے کر نازل ہوتے تھے جس طرح قرآنی آیات کو۔

(iii) ان کی اطاعت رسولؐ اللہ کی اطاعت ہے۔

(iv) یہ مستقل دین ہے

(v) اگر قرآن کا کوئی حکم ان کے خلاف جائے‘ تو سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ کیونکہ حدیث‘ قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔

اس سے آپ اندازہ لگایئے کہ اس راستے سے کیا کیا خارجی چیزیں دین میں داخل نہ ہو گئی ہوں گی اور انہوں نے کس کس طرح سے دین کو مذہب

میں بدل نہیں دیا ہوگا؟ یہ کچھ نادانستہ بھی ہوا ہوگا اور دین کے دشمنوں نے ایسا کچھ دانستہ بھی کیا ہوگا۔ بہرحال، دانستہ ہوا ہو یا نادانستہ، نتیجہ یہ کہ یہ سب کچھ دین بن گیا اور انہی کی اطاعت کا نام رسولؐ اللہ کی اطاعت قرار پا گیا۔ اس سے آگے بڑھے، تو انہی کی رُو سے قرآنِ کریم کی تفسیر کر دی گئی۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ فلاں معاملہ میں قرآن یوں کہتا ہے اور روایت اس کے خلاف کہتی ہے، تو فوراً" کہہ دیا جاتا ہے کہ تم قرآن کو زیادہ سمجھتے ہو یا رسولؐ اللہ زیادہ سمجھتے تھے! یہ جواب ایسا ہے جس کے سامنے کسی کو مجالِ لب کشائی نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جس تفسیر کو رسولؐ اللہ کی تفسیر کہہ کر پیش کیا جاتا ہے، وہ صرف رسولؐ اللہ کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ اس کی کوئی سند نہیں ہوتی کہ وہ واقعی رسولؐ اللہ کی ہے۔ اس کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ سارا قرآن ان روایات کے تابع چلا گیا۔ اب مذہب کا مدار روایات پر قرار پا گیا اور قرآن ثواب کی غرض سے تلاوت کے لئے باقی رہ گیا۔ یہی وہ مذہب ہے جو ہزار سال سے ہمارے ہاں مروّج چلا آرہا ہے۔

فقہ بعض بزرگوں نے اپنے اجتہاد سے کام لے کر، وقت کی ضرورتوں کے مطابق بعض مسائل کا فیصلہ کیا، انہیں فقہ کے احکام کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ احکام وقتی تھے اور جن تقاضوں کے ماتحت وہ مرتّب کئے گئے تھے، ان کے بدل جانے سے وہ احکام بھی بدل جانے چاہئیں تھے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد، یہ عقیدہ وضع کر لیا گیا کہ یہ تمام احکام بھی ہمیشہ غیر متبدّل رہیں گے اور آئندہ کسی کو حق نہیں ہوگا کہ وہ اس بارے میں اجتہاد کرسکے۔

تصوّف روایات اور فقہ میں پھر بھی کسی نہ کسی سند کی ضرورت پڑتی تھی۔ لیکن اس کے بعد ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس میں کسی حکم کے لئے سند کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ تھا کشف والہام۔ ایک بزرگ کہہ دیتا کہ مجھے یہ بات کشف سے معلوم ہو گئی ہے اور کشف سے مراد تھی براہِ راست خدا سے ہمکلامی یا وہ "علم لدنّی" جو بغیر ظاہری اسناد کے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آرہا ہے' یعنی ختمِ نبوّت کا عقیدہ بھی اور خدا سے ہم کلامی بھی۔ رسول اللہؐ کے متعلّق خدا کے اس حکم پر بھی ایمان کہ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ (۵ : ۶۷) (جو آپ پر وحی کیا جاتا ہے' اسے سب تک پہنچا دو) اور اس کے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی کہ رسول اللہؐ نے "دین کا مغز" کھلے بندوں دُنیا تک نہیں پہنچایا تھا' اسے سربستہ راز کے طور پر اس طرح سینہ بہ سینہ آگے منتقل کیا تھا کہ کسی اور کو خبر نہ ہونے پائے۔ یہ تھا تصوّف۔ اس میں "مذہب" اپنے مقصد میں اور بھی کامیاب ہو گیا۔ مذہب کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ دنیاوی امور دنیاداروں کے لئے ہیں اور مذہب کا کام عاقبت سنوارنا ہے۔ تصوّف میں یہ عقیدہ اپنی انتہا تک پہنچ گیا۔ اس نے کہا کہ کشف و کرامات' خدا سے ہمکلامی اور رسول اللہؐ کے علم لدنّی کی وراثت صرف اسی کو نصیب ہو سکتی ہے جو دنیا کو ترک دے۔ جس کے دل میں دنیا کا ذرّہ بھر بھی خیال باقی رہا' وہ اس راہ میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ اس مسلک نے ملوکیت کو یکسر بے لگام کر دیا۔ اسی جہت سے ہم نے تصوّف کو مذہب کی انتہائی شکل قرار دیا ہے۔ یہاں پہنچ کر دین کا تصوّر کسی دھندلی سی شکل میں بھی باقی نہیں رہتا۔ مذہب کی رُو سے مقصدِ زندگی

قرار پاتا ہے انفرادی نجات اور تصوّف کی رُو سے انفرادی نجات (تزکیۂ نفس) کا ذریعہ قرار دیا جاتا ہے ترکِ دنیا' ترکِ لذّات۔

☆☆☆

اختلافات جس نظریہ یا پروگرام کی صداقت کا معیار اس کے بدیہی اور ٹھوس نتائج ہوں' اس میں اختلافات کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ دنیا میں بیس مختلف مقامات پر سائنس دان اپنی اپنی تجربہ گاہوں میں پانی کا تجزیہ کریں' ان سب کا نتیجہ عمل ایک ہوگا۔ اس لئے اس باب میں ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ اختلاف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آپ ٹھوس حقائق کی دنیا (Matter of Fact World) سے الگ ہو کر محض نظری اور مجرد (Abstract) مباحث میں الجھ جائیں۔ دین کا نظام اپنی صداقت کیلئے ٹھوس نتائج کو معیار قرار دیتا تھا' جو اسی دنیا میں سامنے آجاتے تھے۔ لہذا' دین میں اختلاف کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ایک قانون' ایک نظام' اس پر عمل پیرا ہونے والوں کی ایک جماعت' ایک نہج فکر' ایک طریق کار۔ لہذا' ایک ہی نتیجہ۔ پھر تشتّت و انتشار اور تباین و تخالف کہاں سے آسکتا تھا؟ لیکن جب دین مذہب میں تبدیل ہو گیا' تو مذہب کی ساری گفتگو "آخرت" سے متعلق تھی اور آخرت کسی کی آنکھوں کے سامنے نہیں تھی جو یہ معلوم ہو جاتا کہ مذہب کے دعاوی صحیح ہیں یا غلط۔ مثلاً" ایک شخص آپ سے کہتا ہے کہ یوں نماز پڑھئے' اس سے آپ کی نجات ہو جائے گی۔ دوسرا کہتا ہے کہ نہیں' یوں نہیں' یوں پڑھئے' تب آپ کی نجات ہوگی۔ آپ کے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ کس طریق سے آپ کی نجات

ہو گی۔ لہٰذا، نظری عقائد اور ان اعمال و رسوم میں جن کے نتائج، اگلی دنیا پر اُٹھا رکھے جائیں، اختلاف[1] لازمی ہے۔ اس لئے اگر دین کی اُمّتِ واحدہ، مذہب میں پہنچ کر بہتّر فرقوں میں بٹ جائے، تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؟ فرقہ بندی کو قرآن نے شرک قرار دیا تھا، اس لئے "مذہب" پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا تھا کہ اس میں فرقے کیوں ہیں! اس کے جواب کے لئے، وہی روایات سازی پھر کام آگئی۔ عربی کا فقرہ **اختلاف امتی رحمتہ** (میری اُمّت میں اختلاف رحمت کا باعث ہے) تراشا گیا اور اسے منسوب کر دیا گیا اس ذاتِ گرامیؐ کی طرف جس کی بعثت کا مقصد تمام دنیا کے اختلاف مٹانا تھا۔ جب وہ فقرہ حدیث بن گیا، تو اختلاف کے رحمت ہونے میں کیا شبہ باقی رہا۔ قرآنِ کریم گروہ بندی اور فرقہ سازی کو شرک قرار دیتا تھا، لیکن اس "حدیث" نے اسی شرک کو عین رحمت بنا کر دکھا دیا۔

یہ کچھ مذہب کی طرف سے ہو رہا تھا۔ دوسری طرف دنیا والے (اربابِ ملوکیت) باہم خانہ جنگیوں میں مصروفِ پیکار تھے۔ دین میں اقتدار، اشخاص کے ہاتھوں میں نہیں رہتا، لیکن ملوکیت میں تمام اقتدار و اختیار انسانوں کے ہاتھوں میں آجاتا ہے۔ جب قوت کسی ایک انسان کے ہاتھوں

---

[1] اس میں شبہ نہیں کہ قرآنِ کریم نے بھی احکام کے علاوہ، حقائق کو تشبیہات کی رُو سے بیان کیا ہے لیکن ان حقائق کی سند خود قرآنِ کریم ہے۔ اس لئے جب سند ایک ہو، تو پھر ان حقائق کے سمجھنے میں غور و فکر کے اعتبار سے فرقِ مراتب ہو سکتا ہے، اُمّت کے عمل میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔

میں آجائے گی، تو وہ یہی چاہے گا کہ وہ قوت اسی کے ہاتھ میں رہے، لیکن اس کے مخالفین چاہیں گے کہ قوت ان کے ہاتھ میں آجائے۔ لہٰذا، ملوکیت میں نظامِ حکومت کی وحدت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا بھی ضروری تھا۔

چنانچہ مذہب نے حالت یہ پیدا کر دی کہ مِلّت کی عظیم اکثریت کو امورِ دنیا سے نفرت دلا کر "عاقبت سنوارنے" کے گورکھ دھندوں میں اُلجھادیا اور نظری مباحث سے ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے، انہیں گروہوں اور فرقوں میں بانٹ دیا۔ دوسری طرف دنیا سمٹ کر چند افراد، چند خاندانوں کے قبضہ میں آگئی اور ان میں تقسیم پر باہمی کشت و خون شروع ہوگیا۔

لہٰذا، جس زمانے میں جنگ و جدل سے امن ہوتا تھا، مِلّت مذہبی مباحثات و مناقشات میں اُلجھی رہتی تھی اور جب اربابِ اقتدار میں باہمی جنگ ہوتی تھی، تو مذہب اس جنگ کو جہاد کا نام دے کر مِلّت کو میدانِ جنگ میں لے جاتا تھا جہاں ایک مسلمان کی تلوار دوسرے مسلمان کے سینے میں پیوست ہوتی تھی اور اس طرح ان میں سے قتل کرنے والا غازی اور قتل ہونے والا شہید قرار دیا جاتا تھا۔ حالانکہ قرآن پکار کر کہہ رہا تھا کہ **وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا** ○ (۴ : ۹۳) (جو ارادۃً" کسی مومن کو قتل کر دے، وہ سیدھا جہنّم میں جائے گا جس میں ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی اور اس کے لئے سخت عذاب تیار رہے گا"۔ یہ خدا کا فرمان تھا، لیکن اربابِ مذہب ان قاتلوں کو جنّت کے

پروانے تقسیم کرتے تھے۔ اس لئے کہ یہی ملوکیت کا تقاضا تھا، مذہب کا منصب ملوکیت کا استحکام (اس طرح اپنی بقا) تھا۔

☆☆☆

جو کچھ اُوپر لکھا گیا ہے، اگر کوئی شخص اس پر تھوڑے سے وقت کیلئے بھی خالی الذہن ہو کر غور کر لے گا، تو وہ بلا تأمل اس نتیجے پر پہنچ جائے گا کہ یہ سب باتیں خلافِ عقل و بصیرت تھیں۔ اس لئے کہ اس کے دل میں لامحالہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ مذہب نے اس قسم کی باتوں کو منوا کیسے لیا؟ اسلام نہ سہی، وہ لوگ بالآخر، انسان تو تھے۔ اگر وہ قرآنی بصیرت سے نہیں، محض انسانی دانش ہی سے کام لیتے تو مذہب کے ایسے کُھلے ہوئے اور کمزور حربوں کا کبھی شکار نہ ہوتے۔

مذہب بھی اس خطرہ کو محسوس کرتا تھا، اس لئے اس نے ان کی روک تھام کی بھی فکر کر لی تھی۔

مذہب میں عقل کو دخل نہیں

دین، اپنی دعوت کی صداقت کے لئے دلائل و براہین اور اپنے ٹھوس تعمیری نتائج پیش کرتا تھا، اس لئے کہ اس کی دعوت یکسر علیٰ وجہ البصیرت تھی۔ **اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ** (۱۲:۱۰۸)۔ لیکن یہی بصیرت مذہب کی دشمن تھی۔ اس لئے مذہب نے یہ عقیدہ پیدا کیا کہ مذہبی معاملات میں عقل کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔ جو عقلی توجیہات طلب کرے گا، وہ ابلیسی گروہ میں شامل ہوگا۔ اس لئے کہ "**اول من قاس ابلیس**" جس نے سب سے پہلے عقلی قیاس سے کام لیا تھا، وہ ابلیس تھا۔ اسکے برعکس، جنّت بے وقوفوں کیلئے

ہے۔ (**اهل الجنة بُلْهٌ**) ۔ لہٰذا' جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے' سوچ سمجھے بغیر اس پر عمل کیے جاؤ۔ مذہب نے اپنے پہلے مخاطبین سے تو یہ کہا اور اس کے بعد آنے والی نسلوں سے یہ کہ تم صرف یہ دیکھو کہ تمہارے اسلاف کی روش کیا تھی۔ تم آنکھیں بند کر کے ان کی تقلید کیے جاؤ۔ یہی راہِ ثواب ہے' یہی جنّت کا سیدھا راستہ ہے۔

تقلید یوں تو مذہب کی طرف سے لایا ہوا ہر نظریہ اور ہر تصوّر تباہی اور بربادی کا پیامبر ہوتا ہے' لیکن ان میں سے عقیدۂ تقلید کے اثرات سب سے زیادہ تباہ کن اور مضرّت رساں ہوتے ہیں۔ غور کیجئے' حیوان انسان میں مابہ الامتیاز شے کون سی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ عقل ہے۔ اب جس نظریۂ زندگی میں عقل کو سلب کر دیا جائے' اس کی رُو سے انسان' حیوان بلکہ حیوان سے بھی بدتر بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے عقل و دانش سے کام نہ لینے والوں کو **شَرَّ الدَّوَآبِّ** (۸ : ۲۲) (بدترین خلائق) اور حیوانات سے بھی گئے گزرے ہوئے قرار دیا ہے۔ (**اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ** (۷ : ۱۷۹)) تقلید سے انسان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ **لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا** دل تو ہوتا ہے' لیکن اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ **وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا** آنکھیں تو ہوتی ہیں' لیکن ان سے دیکھتے نہیں۔ **وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا** کان بھی رکھتے ہیں لیکن ان سے کبھی سنتے نہیں۔ یہی ہیں جن کے متعلق فرمایا کہ یہ سیدھے جہنّم میں جاتے ہیں۔ (۷/۱۷۹) ان کا مسلکِ زندگی یہ ہوتا ہے کہ جس روش پر اپنے اسلاف کو دیکھا' گوش بند و چشم بند و لب بہ بند۔ اس روش پر اندھا دھند چلے جاتے

ہیں اِنَّھُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَ ھُمْ ضَآلِّیْنَ۔ فَھُمْ عَلٰٓی اٰثٰرِھِمْ یُھْرَعُوْنَ (۳۷ : ۶۹ - ۷۰)۔ ان کا ٹھکانہ جہنم کے سوا اور کہاں ہو سکتا ہے؟ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَھُمْ لَاِلَی الْجَحِیْمِ (۳۷ : ۶۸)۔ اس حقیقتِ کبریٰ پر غور کیجئے کہ قرآن نے اسلاف کی کورانہ تقلید کرنے اور اپنی عقل وفکر سے کام نہ لینے والوں کا مقام جہنم بتایا ہے۔ جنّت اور جہنم کے قرآنی مفہوم کی تبیین کا یہ مقام نہیں، اس کے متعلق کسی دوسرے وقت گفتگو کی جا سکے گی[1]۔ اس وقت صرف اتنا دیکھ لیجئے کہ کائنات میں ہر شے اپنی ارتقائی منزل طے کرتی ہوئے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جو شے کسی سبب سے آگے بڑھنے سے رُک جاتی ہے، وہ ختم ہو جاتی ہے۔ آفاقی دنیا کی طرح، انسانی دنیا میں بھی یہی قانونِ ارتقاء جاری و ساری ہے۔ انسانیت کا ارتقاء علم و دانش کی راہ سے ہوتا ہے۔ ہر نئی نسل کے سامنے اس کے ماحول کے موانع و مشکلات ہوتی ہیں، جنہیں سر کر لینے سے وہ نسل آگے بڑھتی ہے۔ اسی کا نام تخلیقِ مقاصد ہے۔ زندگی نام ہی تخلیقِ مقاصد کا ہے۔

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

مقاصد کی تخلیق جدّتِ فکر و نُدرتِ خیال کی رہین ہوتی ہے۔ اگر کسی قوم میں فکر کی تازگی باقی نہ رہے، اس کے قوائے فکریہ معطّل ہو جائیں، تو وہ قوم تخلیق کی اہل نہیں رہتی۔ لہٰذا، وہ قابلِ نمود (Dynamic) اور ذی حیات (Organic) ہونے کی بجائے مٹّی اور پتھر کا ڈھیر بن کر رہ

---

[1] دیکھئے میرے مقالات "نجات" اور "ارتقاء" جو "سلسبیل" میں شامل ہیں۔

جاتی ہے اور مٹّی اور پتھّر سے جہانِ نو کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

قرآن، اِرتقائی منازل طے کرنے والی قوم کو جنّت کی مستحق قرار دیتا ہے اور کسی ایک مقام پر رُک جانے کا نام جہنّم[1] رکھتا ہے۔ قانونِ ارتقاء کے ماہرین ہمیں بتاتے ہیں کہ کوئی ذِی حیات، جس عُضو سے کام لینا چھوڑ دے، رفتہ رفتہ، فطرت اس عُضو کو بے کار سمجھ کر اس کی افزائش (بلکہ پیدائش) ہی روک دیتی ہے۔ اس طرح جب کوئی قوم سمجھ سے کام لینا ہی چھوڑ دے، تو کچھ نسلوں کے بعد اس قوم میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ تقلید کا وہ تباہ کن اور دُور رس اثر ہے جس کی طرف ہم نے اُوپر اشارہ کیا ہے۔ اس سے صرف موجودہ نسل ہی تباہ نہیں ہوتی، اس قوم کی آنے والی نسلیں بھی برباد ہو جاتی ہیں۔ اس قوم میں "انسان" پیدا ہی نہیں ہوتے، حیوان پیدا ہوتے ہیں اور حیوان ہی مر جاتے ہیں۔ تقلید کی ان ہلاکت آفرینیوں اور تباہ کاریوں کے پیشِ نظر قرآن نے اس شدّ و مد سے اس کی مخالفت کی ہے۔ اس نے بتایا کہ ہر رسولؑ کا پیغام تقلید کی مخالفت کرتا تھا اور اسی بناء پر ان رسولوںؑ کے پیغام کی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ وہ مقلدین کو علم ودانش (یعنی دین) کی طرف دعوت دیتے تھے اور یہ اسلاف کی تقلید کو حسن کارانہ شیوۂ زندگی ٹھہراتے تھے۔ خدا کے رسولؑ اس قوم کو اس مسلک کے خلاف جھنجھوڑتے تھے اور قوم

---

[1] جہنّم کیلیے قرآن میں لفظ جحیم بھی آیا ہے جس کے معنی روک دینے کے ہیں۔

اتنی ہی سختی کے ساتھ اس کی مخالفت کرتی تھی۔ ان کی مخالفت بھی بجا تھی۔ علم الحیوانات کے ماہرین بتاتے ہیں کہ کبھی چمگادڑ (خفاش) کی آنکھیں بھی دوسرے پرندوں کی طرح کھلی ہوئی تھیں۔ چمگادڑوں نے ان سے کام لیناچھوڑ دیا تو ان کی آنکھوں کی ساخت ہی ایسی ہوگئی کہ وہ نورِ آفتاب کی تاب نہیں لا سکتے۔ اس لئے ان کا سب سے بڑا دشمن سورج ہوتا ہے۔ وہ تو یوں کہئے کہ اُن کا بس نہیں چلتا' ورنہ وہ کبھی سورج کو اُفق سے اُبھرنے نہ دیں۔ رسولؐ دین کی روشنی عطا کرتے تھے اور ان لوگوں کی حالت چمگادڑوں کی طرح ایسی ہو چکی ہوتی تھی کہ انہیں اس روشنی سے تکلیف پہنچتی تھی' اس لئے اس کی مخالفت کرتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر رسولؑ کا یہی پیغام تھا اور ہر رسولؑ کی اسی طرح مخالفت ہوتی رہی۔ وہ حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق کہتا ہے کہ جب انہوں نے دین کی روشنی کی طرف دعوت دی' تو آپ کی قوم نے یہی جواب دیا کہ **مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا اِلٰی اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِیْنَ** (۲۳ : ۲۴) "ہم نے یہ بات اسلاف سے نہیں سنی"۔ اس لئے ہم اسے تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ یہی جواب حضرت صالح علیہ السلام کو ملا' جب آپ کی قوم نے کہا **اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا** (۱۱ : ۶۲) کیا تو ہمیں ان کی عبودیت سے روکتا ہے جن کی عبودیت ہمارے اسلاف کرتے چلے آرہے ہیں؟ یہی کچھ قومِ شعیبؑ نے کہا۔ (۱۱ : ۸۷) یہی جواب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملا **قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا** (۱۰ : ۷۸) "کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہمیں اس راہ سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو

دیکھا ہے"؟ یہی قوم حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ (۲۶ : ۷۴)، انہوں نے کہا ہم نے اپنے اسلاف کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے"۔ یہی جواب حضور نبیؐ اکرمؐ کو ملا۔ سورۃ لقمان میں ہے:

> وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (۳۱ : ۲۱)
>
> "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو، تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں، ہم تو اسی کا اتباع کریں گے جس کا اتباع ہمارے اسلاف کرتے چلے آئے ہیں"

غور کیجئے! قرآن نے دین اور مذہب کا فرق کتنی وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ مذہب، اسلاف پرستی (تقلید) سکھاتا ہے۔ دین اس تقلید سے روکنے کے لئے آتا ہے، تاکہ انسان وحی کی روشنی میں اپنی عقل و خرد سے کام لے۔ یہی شرفِ انسانیت اور احترامِ آدمیت ہے۔ لیکن تقلید پرست لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ قرنہا قرن کی تقلید نے ان کی آنکھوں کو چمگادڑ کی آنکھیں بنا دیا ہے، اس لئے انہی روشنی سے سخت تکلیف ہوتی ہے اور اس کی مخالفت میں چلّا اٹھتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر رسولؑ کی دعوت کے ساتھ یہی ہوتا رہا (۱۴ : ۱۰)۔ وہ تاریخی نظائر و شواہد سے بتاتا ہے کہ تقلید سے انسان کی نگاہ ایسی غلط انداز ہو جاتی ہے کہ وہی عقل و دانش جو اس کیلئے مابہ الامتیاز تھی، اسے مارِ سیاہ بن کر دکھائی دینے لگ جاتی ہے۔

تقلید میں چونکہ مستقبل تاریک اور ماضی درخشندہ نظر آتا ہے' اس لئے انسان کی نگاہیں سامنے کی بجائے پیچھے کی طرف رہتی ہیں۔ اس کا منہ اُلٹا ہوتا ہے (یعنی آنکھیں گُدّی کی طرف ہوتی ہیں۔) یہی جہنّم کی زندگی ہے۔ **يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ** (٣٣ : ٦٦) "جس دن ان کے چہرے جہنّم میں اُلٹے کر دیئے جائیں گے"۔ یہی وہ اوندھے منہ چلنے والے ہیں' جن کے متعلق دوسری جگہ فرمایا **اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ** (٦٧ : ٢٢) "کیا وہ جو اپنے منہ کے بل اوندھا چلا جا رہا ہو' سیدھے راستہ پر ہے یا وہ جو ہموار و متوازن راہ پر سیدھا چلا جا رہا ہو"۔ سورہ یٰسین میں ہے کہ تقلید سے رسومِ کہنہ کے طوق و اغلال اس بری طرح گردن کو جکڑے رہتے ہیں کہ ان سے گردن اُوپر کی اُوپر اُٹھی رہتی ہے اور انسان کو اپنے سامنے کا راستہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ **اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ** (٣٦ : ٨) "ہمارے قانون نے ان کی گردنوں میں ایسے طوق ڈال رکھے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک چڑھ گئے ہیں جن سے ان کی کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ ان سے سر اُوپر کے اُوپر اُٹھے رہتے ہیں"۔ اور یہ اپنے سامنے کا راستہ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ یہی وہ اطواق و اغلال تھے جنہیں اُتارنے کے لئے رسولِ اکرمؐ تشریف لائے (**وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ** (٧ : ١٥٧) ۔ جب ایک عرصہ کی تقلید سے قوم کے قوائے فکریہ اس طرح سے مفلوج ہو جاتے ہیں کہ وہ کام کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے تو' قرآن کے الفاظ میں' اس قوم کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ **وَجَعَلْنَا**

مِنْ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ (۳۶ : ۹) ”ہمارا قانونِ فطرت اس کے سامنے بھی دیواریں کھینچ دیتا ہے اور ان کے پیچھے بھی اور (ان کی عقل و خرد پر) پردے ڈال دیئے جاتے ہیں اور ان کی بصارت سلب کرلی جاتی ہے“۔ اسی حقیقت پر باندازِ دگر غور کیجئے۔ ذہن انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں اتنی استعداد نہیں رکھتا تھا کہ ہر نسل اپنے لئے آپ راہیں تراشے۔ عام راستوں سے ہٹ کر سوچنے والے انسان (یعنی مقاصد کی تخلیق کرنے والے دماغ) بہت کم پیدا ہوتے تھے۔ اسی لئے ہر آنے والی نسل کے لئے یہی راہ آسان اور احتیاط کی تھی کہ وہ اپنے اسلاف کی باتوں کو جمع کر کے ان پر عمل پیرا ہوتی رہے۔ اس کا نام تقلید ہے۔ یوں بھی، اس زمانے میں زندگی کی رفتار ایسی سست تھی کہ نئے تقاضے ..... جلدی جلدی سامنے نہیں آیا کرتے تھے۔ قرآن نے انسانیت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اس نے کہا کہ اب عقل و علم کے خزانے عام کر دیئے گئے ہیں۔ اب ذہنِ انسانی سن رشد و بلوغت کو پہنچ چکا ہے، اس لئے اب انسانوں کے لئے صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ وہ استقرائی علم سے اپنی راہیں آپ تراشیں۔ اس نے انسانی سعی و کاوش کو ناکامیوں اور نامرادیوں سے بچانے کے لئے وہ مستقل اصول دے دیئے جو مرورِ زمانہ سے تغیر پذیر نہ ہوں اور کہہ دیا کہ ان اصولوں کی روشنی میں ہر نسل اپنے زمانے کے تقاضوں کے حل آپ تلاش کرے۔ مستقل اصول اس لئے از خود دیئے کہ عقل کا طریق تجرباتی ہوتا ہے، اس کے سامنے جب کوئی نیا سوال آئے تو وہ اس کے حل کے لئے ”تجربتہ“ ایک راستہ اختیار کرتی

ہے۔ لیکن بڑی جانکاہ مشقتوں کے بعد اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ راستہ غلط تھا۔ پھر وہ اسے چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرتی ہے۔ عقل اس طرح ہڈیاں تڑواتی اور خون اور آگ کی خندقیں پھاندتی، ناکام تجارب کی تلخیوں اور صعوبتوں کے بعد کہیں جا کر صحیح مقام تک پہنچتی ہے۔ وحی نے انسان کو ان تجربات کی مشقتوں سے بچانے کیلئے مستقل اصولِ حیات دے دیئے تاکہ ان کی روشنی میں اپنی منزل تک باآسانی پہنچ جائے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں وحی کا مقصد (Economising Human Efforts) ہے، لہٰذا، انسان کے پاس وحی کی روشنی، اپنی عقل کی آنکھ اور سابقہ نسلوں کے تجربات کے نتائج ہوتے ہیں۔ گزشتہ نسلوں کا تجربہ (جسے تاریخ کی یادداشتیں کہتے ہیں) بڑی کارآمد شے ہے۔ اس لئے قرآن نے اس کی اہمیت کو بھی اُجاگر کیا۔ لیکن اس تجربے سے مستفید ہونے اور آنکھیں بند کر کے پرانی ڈگروں پر چلے جانے میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ یہ دین کا نظام تھا۔ لیکن مذہب نے آنے والی نسلوں کو اسلاف کی تقلید کی زنجیروں میں جکڑ کر، آگے بڑھنے والی انسانیت کو پھر وہیں پہنچا دیا جہاں وہ انسانیت کے عہدِ طفولیت میں تھی اور اس طرح وہ انسان کی تاریخ کو ہزاروں سال پیچھے کی طرف لے گیا۔

مذہب، تقلید کے عقیدہ سے، انسانوں کو اس مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔

نفرت ہی نفرت اب آگے بڑھئے۔ دنیا سے نفرت اور علم و عقل سے دشمنی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر شے قابلِ نفرت بن جاتی ہے۔

چنانچہ مذہب پرست لوگوں کی نگاہ میں کائنات کے ہر گوشے میں شر ہی شر دکھائی دیتا ہے۔ انہیں ہر حسین شے سے کراہت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر تبسم فشاں چہرہ اُنہیں موت کا آئینہ دار اور ہر گُل فشاں پیشانی جہنم کا کندہ دکھائی دیتی ہے۔ جب بہار خوشی کے جھولے جُھولتی ہے' تو وہ ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں۔ جب چاندنی مسکراتی ہے' تو وہ منہ بِسور لیتے ہیں۔ ان کے بجھے ہوئے چہرے اور نورِ مسّرت سے محروم آنکھیں صاف بتارہی ہوتی ہیں کہ یہ ان میں سے ہیں جن کی آرزوؤں کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ

آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں

حُسنِ فطرت

اوب' موسیقی' آرٹ' سائنس' زیبائش و آرائش کے شگفتہ اسباب و ذرائع ان کے مذہب میں حرام ہوتے ہیں۔ دین' کائنات کے حسن سے بہرہ یاب اور اس کے حسن میں نت نئے اضافے کرنے کی تعلیم دینے کے لئے آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنے اپنے مقام پر صحیح انداز میں رکھی گئی ہے۔ جب ہر چیز اپنے اپنے مقام پر رہے' تو اس کا ماحصل حسنِ کائنات ہوتا ہے۔ لیکن اگر خیر سے خیر شے کو بھی اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے' تو وہ شر بن جاتی ہے۔ حسن موزونیت کا نام ہے اور موزونیت یہی ہے کہ ہر شے اپنے صحیح مقام پر ہو۔ پسکال کے الفاظ میں:

> "اگر قلوپطرہ کی ناک ذرا چپٹی ہوتی' تو تاریخی دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا"۔

دین یہ بتاتا ہے کہ زندگی کے موٹر کار میں پٹرول کے ساتھ موبل آئل بھی لاینفک ہے۔ شر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب موبل آئل پٹرول کے ٹینک

میں بھر دیا جائے۔ پھر گاڑی آگے نہیں چل سکتی۔ لہذا' دین کی رُو سے' کائنات کے حُسن سے 'حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے' قلب و نگاہ میں جلا پیدا کرنا' انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا ذریعہ ہے۔ لیکن انسانوں کا خود ساختہ مذہب' کائنات کے ہر حسین نقشے پر ناک بھوں چڑھاتا اور اسے حرام قرار دیتا ہے۔

یہاں سے ایک اور گوشہ سامنے آجاتا ہے

حدود اللہ آپ قرآن میں دیکھئے۔ صرف چند چیزیں ہیں جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے۔ چند باتیں ہیں جن سے روکا گیا ہے۔ اس میں متعیّن احکام کی فہرست بڑی مختصر ہے۔ باقی امور کے متعلّق صرف حدود (Boundary Lines) کھینچ دی گئی ہیں اور انسانی فکر کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے مسائل کا حل آپ تلاش کرے۔ قرآن حُرّیتِ فکر پر کم از کم پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اس کا مقصود انسانی صلاحیتوں کو اُبھارنا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (۹ : ۹۲) "جس نے نفسِ انسانی کی صلاحیتوں کو اُبھارا' اس کی کھیتی ثمر بار ہوئی"۔ اس کے برعکس' مذہب کو دیکھئے تو وہ انسانی زندگی کے ایک ایک سانس پر داروغے مقرر کرتا ہے۔ وہ کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی اس کی اجازت نہیں دیتا کہ انسان اپنی عقل و فکر سے کوئی فیصلہ کر سکے۔ وہ بچہ کی پیدائش سے لے کر انسان کے مرنے تک (بلکہ مرنے کے بعد بھی) ایک ایک قدم پر اپنا حکم نافذ کرتا رہتا ہے۔ دایاں قدم اٹھاؤ تو یہ کرو۔ بایاں قدم اٹھاؤ تو یہ پڑھو۔ پانی پیو تو یوں کرو۔ روٹی کھاؤ تو یہ کرو۔

حرام و حلال جیسا کہ اُوپر لکھا جا چکا ہے' دین نے چند چیزوں کو حرام قرار دیا تھا۔ لیکن مذہب میں حلال و حرام کی فہرستوں کو دیکھئے' کتابوں پر کتابیں بھری ہوئی نظر آئیں گی۔ قرآن میں چند چیزوں کو حرام قرار دینے کے بعد فرمایا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ (۱۶:۱۱۶)۔

> "اور دیکھو ایسا نہ کرو کہ تمہاری زبانوں پر جو جھوٹ بات آ جائے' اسے بے دھڑک کہہ دیا کرو کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ چیز حرام۔ اس طرح (حرام حلال ٹھہرانا) اللہ پر افترا پردازی ہے۔ (اس لئے کہ اللہ نے جن چیزوں کو حرام ٹھہرانا تھا' وہ اس نے حرام قرار دے دی ہیں)۔

کسی شے کو انسانوں کے لئے حرام قرار دے دینا کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ انسانی آزادی کو ابدی طور پر جکڑنا ہے۔ اس لئے دین میں یہ اختیار کسی کو نہیں دیا جاتا۔ اس کا اعلان ہے کہ:۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷:۳۲)

> "ان سے پوچھ کہ خدا کی زینتیں جو اس نے اپنے

بندوں کیلئے پیدا کی ہیں اور کھانے پینے کی اچھی اچھی
چیزیں کس نے حرام کی ہیں؟"۔

یعنی خدا کہتا ہے کہ ہمارے سوا اور کون ہے جو کسی چیز کو حرام قرار دے سکتا ہے؟ مذہب کے اجارہ دار خم ٹھونک کر کہتے ہیں کہ ہم ہیں جو انہیں حرام قرار دیتے ہیں۔ وہ خدا سے علی الرغم کہتے ہیں کہ تم اپنی حرام کردہ چیزوں کی فہرست کو دیکھو اور پھر ہماری فہرستوں پر نظر ڈالو۔ خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ حرام قرار دینے کے اختیارات کس کے وسیع ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ دین جب ملوکیت اور مذہب میں بٹ جاتا ہے، تو وہ اختیارات جو خدا نے صرف اپنی ذات تک محدود رکھے تھے، انسانی ہاتھوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اربابِ حکومت، اپنے دائرے میں انسانون کو اپنا محکوم بناتے ہیں اور اربابِ مذہب اپنے دائرے میں انہیں اپنے تابع فرمان رکھتے ہیں۔ یہ حرام وہ حلال، یہ کرو وہ نہ کرو، سب مذہب کے استبدادی فرامین ہیں جو شاہی احکامات سے کسی صورت میں بھی کم نہیں، بلکہ اپنی گرفت کی شدّت میں ان سے بھی زیادہ محکم۔ اس لئے کہ شاہی فرامین کا اثر تو وقتی ہوتا ہے، لیکن مذہب کا استبداد دل کی گہرائیوں تک پہنچ چکا ہوتا ہے۔ حکومتیں آتی ہیں چلی جاتی ہیں، لیکن مذہب کا غلبہ و تسلّط ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ تخت و تاج کی حکومت میں وہ لذت کہاں جو مسانیدِ فتویٰ کی سطوت میں ہے؟

خدا نے انسان کو اختیار و ارادہ عطا کیا تھا۔ دین کا نظام اس اختیار و ارادہ میں وسعتیں عطا کرتا اور اس سے ایسے نتائج پیدا کرتا تھا جس سے انسانیت کو عروج و ارتقاء حاصل ہو۔ مذہب اپنے استبدادی احکام سے اس

اختیار و ارادہ کو کچلتا ہے۔ لہٰذا مذہب یکسر غیر انسانی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ جب آپ خلافِ انسانیت زندگی پر مجبور کئے جائیں گے، تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ:

۱۔ یا تو آپ کی انسانیت مسخ ہو جائے گی اور آپ شرفِ اختیار و ارادہ کو چھوڑ کر جمادات و نباتات کی سی زندگی بسر کرنے لگ جائیں گے (مذہب میں قوم کی اکثریت کی یہی حالت ہوتی ہے، اس لئے وہ تقلید پر رضا مند ہو جاتے ہیں)۔

۲۔ یا آپ ان مستبدانہ پابندیوں سے ایسی سرکشی اختیار کر جائیں گے کہ پھر آپ ان حدود کا بھی احترام نہیں کریں گے جو دین نے اصولی طور پر متعین کئے ہیں (اس قسم کے سرکش اور بے باک انسان بالعموم مذہب گزیدہ ہوتے ہیں)۔

۳۔ اور یا پھر منافقت کی زندگی بسر کریں گے۔

منافقت شق سوم ذرا تفصیل طلب ہے۔ چونکہ مذہب کی پابندیاں جائز آزادی کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوتی ہیں، اس لئے انسان کا جی چاہتا ہے کہ ان پابندیوں کو توڑ ڈالے۔ لیکن مذہبی زندگی کا تقدس اسے اعلانیہ ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا، اس لئے وہ فریب کارانہ راہیں تلاش کرتا اور بہانے تراشتا ہے۔ وہ حدود اللہ میں رہتے ہوئے حُسنِ فطرت سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کیف اندوز نہیں ہوتا، کنکھیوں سے اس

کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ موسیقی کو حرام قرار دیتا ہے لیکن مزامیر (سازوں) کے بغیر سن لینے میں کوئی باک نہیں سمجھتا۔ اس سے بھی اس کی تسکین نہیں ہوتی، تو وہ اس موسیقی کو قوالی کا نام دے کر جزوِ عبادت بنا لیتا ہے۔ آرٹ اس کے نزدیک سخت قابلِ نفرت شے ہے، لیکن "ہاف ٹون تصویر[1]" اُتروا لینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا۔ حُسن اور اس کی نیرنگیوں کا تصوّر تک بھی اس کے نزدیک جہنّم میں پہنچا دینے کے لئے کافی ہوتا ہے، لیکن وہ ایک "معشوقِ حقیقی" کی فریب انگیز اصطلاح میں حُسن کی شعبدہ کاریوں اور بادۂ گلفام کی کیف باریوں کے سرور آور تذکرے جھوم جھوم کر سنتا ہے اور اس طرح ذہنی تعیّش سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ماہرینِ نفسیات، نفسیاتی تجارب کے بعد، اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس قسم کے منافقانہ دباؤ (Repression) سے جنسی بدنہادی (Sex-Perversion) پیدا ہو جاتی ہے[2] جس کے مظاہرے بڑے گھناؤنے ہوتے ہیں۔ اسی جنسی

---

[1] تصویر کے مسئلہ پر ایک مرتبہ، ہندوستان کی ایک نامور مذہبی ہستی نے، جن کا اب انتقال ہو چکا ہے، تفصیلی بحث کرنے کے بعد یہ ثابت کیا تھا کہ اوپر کے دھڑ (BUST) کی تصویر اُتروانا جائز ہے۔ اسے انہوں نے (HALF TONE) سے تعبیر کیا تھا، حالانکہ "ہاف ٹون" کچھ اور ہی ہوتا ہے اور اب تو کھلے بندوں تصویر اتروانے میں بھی باک نہیں سمجھا جاتا۔

[2] (SEX-PERVERSION) کے لئے کوئی اور موزوں لفظ اس وقت میرے ذہن میں نہیں آرہا۔ بدنہادی اس کا پورا پورا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے۔

(باقی اگلے صفحہ کے نیچے دیکھیں)

بدنہادی کا نتیجہ ہے کہ غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنے کے مدّعی دھڑا دھڑ شادی کیے چلے جاتے ہیں اور بے شمار لونڈیوں سے متمتّع ہونا عین "شریعتِ حقّہ" کے مطابق قرار دیتے ہیں۔ آپ مذہبی کتابوں کو دیکھئے، ان کا کتنا بڑا حصّہ جنسیات سے متعلّق مسائل پر مشتمل ہوتا ہے اور ان کا ذکر ایسی تفاصیل سے بیان کیا جاتا ہے کہ اس پر بے حیائی کی آنکھیں بھی جھک جائیں۔ دین نے صرف پابندیاں عاید کی تھیں جو انسانی معاشرے کے نظم و ضبط کے لیئے لاینفک اور انسانی نشوونما کے لئے ضروری تھیں۔ ان کا نتیجہ غیر فطری دباؤ نہیں، بلکہ دریا کو طغیانیوں سے بچانے کے لئے اس کے ساحلوں کا تعیّن تھا۔ مذہب نے اپنے غیر فطری استبداد سے دریا کے سامنے بند لگا دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا پانی زمین دوز راہوں میں جا چھپا اور جہاں جہاں اسے نرم زمین دکھائی دی، وہیں سے سر نکال لیا۔ اس لئے کہ ابھار پانی کی فطرت کا تقاضا ہے، آپ اس تقاضے کو روک نہیں سکتے۔

پری رُو تابِ مستوری ندارند
چوں دربندی، ز روزن سر برارند

جن تباہیوں کا ذکر پہلے آچکا ہے وہ، وہ تھیں جو مذہب نے خارجی دنیا

(پچھلے صفحہ سے مسلسل)

مسخ شدہ فطرت یا غیر فطری راہوں پر چل نکلنا اس کے مفہوم سے زیادہ قریب ہے، لیکن اس کے باوجود یہ الفاظ (SEX-PERVERSION) کا صحیح مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ جنسی جذبہ کے استعمال کی مکروہ ترین شکلوں کا نام ہوتا ہے۔

مذہبی ضابطہ اخلاق

میں پیدا کیں اور جو خرابیاں اُوپر مذکور ہیں وہ' وہ ہیں جو اس کی وجہ سے دلوں کی داخلی دنیا میں وجود پذیر ہوئیں۔ ان خرابیوں نے پوری قوم کی سیرت کو مسخ کر دیا۔ جب کوئی قوم ایک عرصہ تک اس قسم کی منافقانہ زندگی بسر کرنے کی خُوگر ہو جائے' تو اس قوم سے جرأت و جسارت اور کشادگی و شگفتگی کے جوہر سلب ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ پست حوصلگی اور دوں ہمتی' تنگ نظری اور کوتاہ دامنی کے دنائت آمیز عیوب پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن مذہب ان عیوب کو محاسن بنا کر دکھانے کے لئے ایک اور حربہ استعمال کرتا ہے جسے وہ "ضابطۂ اخلاق" کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ عاجزی اور ناتوانی کو خدا کے بندوں کی صفات قرار دیتا ہے' پست حوصلگی اور دوں ہمتی کا نام صبر اور توکّل رکھتا ہے۔ فاقہ زدگی کو استغناء کے پرفریب نقاب میں چھپاتا ہے۔ بے عملی کی افیون کو تقدیرِ الٰہی کا تریاق بنا کر دکھاتا ہے۔ بزدلی کا نام "مرنجاں مرنج" مسلکِ حیات رکھ دیتا ہے۔ دین یہ کہنے کے لئے آیا تھا کہ ہر وہ فساد انگیز قوت جو رزق کے سرچشموں کو اپنے باپ دادا کی ملکیت قرار دے کر ان پر سانپ بن کر بیٹھ جائے' اس قابل ہے کہ اس کی کلائی مروڑ کر خدا کے دیئے ہوئے رزق کو خدا کے بندوں تک پہنچے دیا جائے۔ مذہب کا ضابطۂ اخلاق اس قسم کی لوٹ کھسوٹ کو " **ھذا من فضل ربی** " کہہ کر ان ناہمواریوں اور دراز دستیوں کو کھلا لائسنس عطا کر دیتا ہے۔ چونکہ مذہب کا دائرہ اثر د نفوذ زیادہ غریب طبقہ تک محدود رہتا ہے' اس لئے وہ ان لوگوں سے اپنا ضابطۂ اخلاق نہایت آسانی سے منوا لیتا ہے۔ باقی رہے ضابطہ کے ایسے گوشے جن کا تعلق اُس بالا دست طبقے سے ہوتا

ہے جس کے ہاتھ میں امورِ دنیاوی کا نظم و انصرام ہوتا ہے' وہ انہیں وعظ و نصیحت کرتا رہتا ہے کہ ظلم کرنا بُرا ہے' غریبوں کو ستانا اچھا نہیں' ہر حق دار کو اس کا حق دینا ضروری ہے' سائل کو ردّ نہیں کرنا چاہیے' محتاج کو دھتکارنا معیوب ہے۔ مذہب اس باب میں اتنا ہی ضروری سمجھتا ہے کہ بالادست طبقہ کو اس قسم کے وعظ کہتا رہے۔ اس کا نام اس نے امر بالعروف و نہی عن المنکر رکھ لیا ہے۔ جب بالادست طبقہ کی طرف سے مفلوک الحال محتاجوں کی طرف کوئی بھیک کا ٹکڑا پھینک دیا جائے' تو مذہب ان کی شان میں قصیدے کہنے شروع کرتا ہے اور ان غریبوں کو جن کے غصب و نہب سے ان بالادستوں کی شان و شوکت قائم ہوتی ہے' **ھل جزاء الاحسان الا الاحسان** کے خود ساختہ' پر فریب مفہوم سے عمر بھر دعائیں دینے اور ان غاصبین کا بے دام غلام بنا رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

یہ ہے اس ضابطۂ اخلاق کی حقیقت جو مذہب کا عُروۃالوُثقیٰ ہوتا ہے اور جسے وہ نہایت بلند آہنگ دعاوی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ قرآن ساری دنیا کو چیلنج دیتا ہے کہ اس کے متعیّن کردہ نظام (دین) کے ضابطہ کی کسی ایک شق کی مثل کوئی قانون مرتّب کر کے دکھاؤ۔ دنیا ایسا قانون مرتّب نہیں کر سکتی جس میں معاشی نظامِ حیات' مستقل اقدارِ سماوی سے ہم آہنگ ہو۔ اس لئے دین اپنے نظام میں بے مثل و بے نظیر ہوتا ہے۔ لیکن مذہب جس ضابطۂ اخلاق کو پیش کرتا ہے' وہ دنیا کی ہر قوم میں مشترک ہوتا ہے۔ اس لئے کسی مذہب کا یہ دعویٰ کہ وہ دوسرے مذہب پر فوقیت رکھتا ہے' بالبداہت باطل ہوتا ہے۔ اسی لئے (مولانا) ابوالکلام آزاد

(مرحوم) نے مسلکِ گاندھوی کی تائید میں اپنے پورے زورِ خطابت کے ساتھ لکھا تھا کہ' عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ ان "عالمگیر سچائیوں" سے مراد یہی ضابطۂ اخلاق تھا' یعنی جھوٹ نہ بولو' زنا نہ کرو' چوری نہ کرو' غریب کو نہ ستاؤ وغیرہ۔ یہ سچائیاں واقعی تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس میں تو بلکہ مذہب کی بھی تخصیص نہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو لامذہب کہتے ہیں اور خدا کی ہستی تک کے بھی قائل نہیں' وہ بھی ان "عالمگیر سچائیوں" کے معترف ہیں۔ دنیا کا کوئی شخص بھی یہ نہیں کہتا کہ جھوٹ بولنا اچھا ہے اور چوری کرنا بڑا مستحسن فعل ہے۔ لہٰذا' اگر اسلام بھی صرف یہی ضابطۂ اخلاق پیش کرتا ہے' تو اس کے اس دعویٰ کے معنی کیا ہیں کہ کوئی انسان میری پیش کردہ تعلیم کی ایک شق کی مثل بھی پیش نہیں کر سکتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام کی پیش کردہ تعلیم اس عام اخلاقی ضابطہ سے ماوراء کچھ اور ہے جس کی مثل و نظیر ناممکن ہے۔ یہ تعلیم ہے اس نظامِ ربوبیت کی جو اسلام کا مابہ الامتیاز ہے اور جس کی نظیر دنیا کا کوئی نظام پیش نہیں کر سکتا۔ عام ضابطہ اخلاق اس نظام کی تمہیدات میں آجاتا ہے۔

دین نظامِ زندگی پیش کرتا ہے لیکن مذہب کے پاس یہ عموی ضابطہ اخلاق ہوتا ہے اور اس کے ساتھ چند رسوم۔ مذہب پرستوں کا ایک طبقہ (جسے اہلِ تصوّف' اہل شریعتِ کہہ کر پکارتے ہیں) اپنی گروہ بندی کو قائم رکھنے کے لئے دوسرے مذاہب سے برسرِپیکار رہنے میں ہی اپنی بقا کا راز مضمر دیکھتا ہے۔ اس لئے وہ اس ضابطۂ اخلاق سے قطع نظر کر کے غیر مذہب

والوں سے اپنے رسوم و مناسک کے اصلح و انفع ہونے پر مناظرے اور مباحثے کرتا رہتا ہے۔ لیکن مذہب کا دوسرا گوشہ جسے تصوّف کہتے ہیں، ان رسوم و مناسک کی اہمیت کو کم کرکے دوسرے مذاہب سے ضابطۂ اخلاق کے اشتراک پر آمادۂ مفاہمت ہو جاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ، یہ مفاہمت ایسی یک رنگ ہو جاتی ہے کہ رام اور رحیم ایک ہی سکّہ کے دو رخ قرار پا جاتے ہیں۔ چونکہ تصوّف کی دنیا جذبات کی پیدا کردہ ہے، اس لئے شاعری اسے خوب ہوا دیتی ہے۔ تصوّف شاعری کے لئے نہایت وسیع میدان پیدا کرتا ہے اور شاعری تصوّف کو حقیقت بنانے کیلئے وہ "دلائل" بہم پہنچاتی ہے جن کی حقیقت تشبیہات سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ اس طرح یہ شاعری بے عمل قوم کے لئے زندگی کا پُرسکون بہانہ بن جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ، شاعری ان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے اور وہ اپنی خانقاہ یا حجرے کے ایک گوشے میں بیٹھے بیٹھے تصوّر ہی تصوّر میں زندگی کے مختلف مراحل و مدارج طے کئے چلے جاتے ہیں۔

افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار

جب کبھی زندگی کا کوئی مسئلہ سامنے آتا ہے، اس کے لئے کسی شاعر کا برجستہ شعر پڑھ دیا جاتا ہے اور اس کے بعد سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ مسئلہ حل ہوگیا۔

مذہب اس سادہ لوح قوم کو اس طرح نظریات میں اُلجھائے رکھتا ہے اور ملوکیت کو کھُلا چھوڑ دیتا ہے کہ وہ جسدِ انسانیت سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لے۔

* * *

کفر بعد از ایمان جب قرآن کا لایا ہوا دین (عملی نظامِ حیات) مذہب اور ملوکیت میں تبدیل کر دیا گیا تو وہ تمام جیتے جاگتے نتائج جو اس نظام کا فطری نتیجہ تھے، معدوم ہونے شروع ہو گئے۔ اس لئے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ یہ نتائج قانون کے ساتھ وابستہ ہیں، کسی قوم کے نام یا اس کی تراش خراش کے ساتھ نہیں۔ لہٰذا، جب اس قوم نے جو اس ضابطۂ حیات کی اصلیت پر یقین رکھتی تھی، اسے ضابطہ ماننے سے عملاً انکار کر دیا، تو اس پر کامرانیوں اور کامیابیوں کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ دیکھئے! قرآن نے اس حقیقت کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے جب فرمایا کہ:

> **كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ**
>
> "بھلا خدا کا قانون اس قوم پر کس طرح عروج وارتقاء کی راہیں کھول دے جو اس قانون کے درخشندہ نتائج پر ایمان لانے کے بعد اس سے (عملاً) انکار کر دے"
>
> **وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ**
>
> درآں حالیکہ اس نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا تھا کہ اس نظامِ حیات پر عمل کرنے والے رسولؐ کی جدوجُہد نے کیسے تعمیری نتائج پیدا کئے تھے۔
>
> **وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ**
>
> اور اس طرح اس نظامِ زندگی کی واضح دلیلیں اس کے

سامنے روشن ہو گئی تھیں۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○

اللہ کا قانون اس قوم پر عروج و ارتقاء کی راہیں کبھی نہیں کھولتا جو حقائق کو اپنی جگہ نہیں رہنے دیتی۔ (ظلم [1])

أُولٰئِكَ جَزَآؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ (۳ : ۸۶ - ۸۷)

ان لوگوں کی اس روش کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان تمام نتائجِ حسنہ سے محروم رہ جاتے ہیں جو خدا کا قانون، اس قانون کو ٹھوس نتائج میں تبدیل کرنے والی کائناتی قوتیں اور انسانوں کا اجتماعی نظام پیدا کرتا ہے۔

ان آیات سے یونہی نہ گزر جائیے۔ یہ ایک عظیم الشان اصول کو بیان کرتی ہیں۔ یہ کفر بعد از ایمان کا نتیجہ بتاتی ہیں۔ ایمان نے انسان کی پوری زندگی کو ناقابلِ تقسیم وحدت قرار دیا تھا۔ اس کے انکار نے اس نظامِ واحد کو دنیا

---

[1] ظلم کے معنی ہیں وضع الشئی فی غیر موضعہ المختص بہ (راغب) یعنی کسی شے کا اس مقام پر نہ رکھا جانا جو اس کے لئے مختص ہے۔ جب کسی نظام کے پرزے اپنی اپنی جگہ پر نہ رہیں تو اس سے اس کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ اس کا نام فساد یا سُوء ہے جو حسن یا اصلاح کی ضد ہے۔ قرآن نے سورۃ نمل میں ظلم کو سُوء سے تعبیر کر کے حسن کے مقابلہ میں رکھا ہے۔ دیکھئے (۲۷ : ۱۱)۔

اور آخرت کے الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر دیا اور اس طرح ملوکیت اور مذہب وجود میں آئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ دین کے نظام کے تمام ٹھوس نتائج سے محروم رہ گئے۔ ملوکیت اور مذہب دونوں دین ہی کے الگ الگ ٹکڑے ہیں، لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ الگ ہو جانے سے ان دونوں میں دین کی کوئی بات بھی باقی نہیں رہتی۔ پانی کی مثال پر پھر غور کیجئے۔ پانی کا فطری خاصہ ہے کہ وہ آگ بجھاتا ہے، لیکن اسی پانی کے اجزائے ترکیبی کو جب الگ الگ کر دیا جائے اور اس طرح پانی کا ہر قطرہ ہائیڈروجن اور آکسیجن میں تبدیل ہو جائے، تو ان اجزاء کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ آگ کو بجھانا تو ایک طرف، ہائیڈروجن خود جلتی ہے اور آکسیجن دوسری چیزوں کو جلنے کا ذریعہ بنتی ہے، کوئی چیز آکسیجن کے بغیر جلتی نہیں۔ یعنی پانی کے اجزائے ترکیبی میں سے کسی جزو میں بھی پانی کی خاصیت (Property) باقی نہیں رہتی، بلکہ اس کے برعکس خاصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح دین جب الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، تو اس کے دونوں ٹکڑوں (حکومت اور مذہب) میں سے کسی میں بھی دین کی خصوصیات باقی نہیں رہتیں۔ بلکہ انکی خصوصیات، دین کی خصوصیات کی ضد ہوتی ہیں۔ دین، وحدت پیدا کرنے والا تھا، ملوکیت اور مذہب نے ملّت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور یہ قانونِ خداوندی سے اعراض برتنے کا فطری نتیجہ تھا (جسے عذاب کہا جاتا ہے)۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ
اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ

> بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ ۗ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ (٦٥ : ٦) ۔
>
> ان سے کہہ دو کہ خدا کا قانون اس پر قادر ہے کہ (اس کی خلاف ورزی کرنے سے) تم پر خارجی دنیا سے عذاب لے آئے یا داخلی دنیا (تمہارے پاؤں کے نیچے) سے یا تم گروہوں میں بٹ کر خلط ملط ہو جاؤ (اور اس طرح تمہاری وحدت ختم ہو جائے) اور تم ایک دوسرے کی شدتِ قوت کا شکار ہو جاؤ۔ دیکھو، ہم کس طرح ان حقائق کو پھیر پھیر کر تمہارے سامنے لاتے ہیں تاکہ تم ان پر غور و فکر کرو۔

اربابِ مذہب، نتائج کو اعمال سے اتنا دُور لے گئے کہ انہوں نے سب کچھ "آخرت" پر اُٹھا رکھا، اس لئے ان کا دنیا میں کچھ حصّہ نہ رہا۔ اہلِ حکومت نے اپنی تمام توجّہات قریبی مفاد (دنیا) ہی پر مرتکز کر دیں، اس لئے ان کا حال تو خوشگوار ہو گیا، لیکن مستقبل روشن نہ ہو سکا۔ اس لئے کچھ عرصہ کے بعد، ان سے حکومت و سلطنت چھن گئی۔ غور کیجئے! قرآن نے حال (دنیا) اور مستقبل (آخرت) کے اس فرق کو کس قدر نمایاں اور حال کے پیش پا اُفتادہ مفاد ہی کو مقصود و منتہیٰ سمجھنے والوں کے مآل کو کیسے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ سورہ التوبہ میں ہے۔

> يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ۭ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ

الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیْلٌ (۹:۳۸)

اے وہ جو ایمان کے دعویدار ہو تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ[1] میں قدم اُٹھاؤ تو تمہارے پاؤں بوجھل ہو کر زمین پکڑ لیتے ہیں، کیا تم مستقبل سے بے فکر ہو کر قریبی مفاد کے پیچھے پڑ گئے ہو؟ اگر ایسا ہی ہے تو (تم نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ) قریبی مفاد تو مستقبل کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ اگر تم اس روش پر قائم رہے، تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟

اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۙ وَّیَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَیْئًا ۗ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۹:۳۹)

اگر تم نے (مستقبل کی تابناکی کے لئے) قدم نہ اٹھایا تو یاد رکھو خدا کا قانون تمہیں اس کی بڑی دردناک سزا دے گا، یعنی تمہاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے

---

[1] فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ) کے قرآنی مفہوم کے لئے آپ کو کچھ وقت اور انتظار کرنا ہو گا۔ سردست اتنا سمجھ لیجئے کہ قرآن اس اصطلاح کو بالعموم اس اجتماعی نظام کے مفہوم میں استعمال کرتا ہے جس کی بنیادیں مستقل اقدار (وحی) پر ہوں اور جو نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے قائم کیا جائے۔

> گا اور تم (اس انحراف سے) خدا (کے قانون) کا کچھ
> نہیں بگاڑ سکو گے (خود ہی تباہ ہو گے) یاد رکھو! اللہ
> نے ہر چیز کے لئے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں جن پر
> اسے پورا پورا کنٹرول ہے۔

چنانچہ اس طرح، رفتہ رفتہ، ان کی وسیع و عریض حکومتیں یا ختم ہو گئیں یا سمٹ سمٹا کر چھوٹی چھوٹی جاگیرداریوں (سلطنتوں) میں تبدیل ہو گئیں۔ ان چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کی حالت یہ ہے کہ یہ مغرب کی بڑی بڑی حکومتوں کے رحمِ و کرم پر زندہ ہیں۔ جب تک اقوامِ مغرب کی سیاسی مصلحت کوشیوں کا تقاضا ہوگا، یہ سلطنتیں قائم رہیں گی، جب ان کے مصالح کا تقاضا دوسرا ہو گا، انہیں ختم کر دیا جائے گا۔ ملّت کی وحدت، مدّت ہوئی ختم ہو چکی ہے۔ ان سلطنتوں میں اس شکل کا اتّحاد بھی نہیں، جس انداز کا اتّحاد مغرب کی غیر مسلم حکومتوں میں ہے۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ ایک سلطنت دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہے، اسی طرح جس طرح ان کا ایک مذہبی فرقہ دوسرے فرقہ سے نبرد آزما ہے۔ نتیجہ اس تشتّت وافتراق کا یہ ہے کہ ان کا معاشرہ اور علمی سرمایہ، ان کے تصوراتِ حیات، ان کے نظریاتِ زندگی، سب کے سب افسردگی کے پیغام بردار ہیں اور موت کے نقیب۔

تمدّن، تصوّف، شریعت، کلام
بُتانِ عجم کے پُجاری تمام

اور یہ اس لئے کہ:

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمّت روایات میں کھو گئی

☆

غور و تدبّر قرآن نے مسلمانوں کو قدم قدم پر دعوتِ فکر دی تھی، زمین و آسمان میں فکر، انفس و آفاق میں فکر، دنیا اور آخرت میں فکر۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ (۲ : ۲۱۹ ـ ۲۲۰)

اس طرح اللہ اپنی نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے
تاکہ تم دنیا اور آخرت میں غور و فکر کرو۔

اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اگر تم "**عذاب النار**" سے بچنا چاہتے ہو، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم ارض و سما میں غور و فکر کرو۔ اس غور و فکر سے تم اُس قانونِ خداوندی کا مطالعہ کر سکو گے جو کائنات کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے اور جب تم یہ معلوم کر لو گے کہ کائنات میں کونسا قانون نافذ العمل ہے جس سے یہ محیّر العقول سلسلہ اس قدر توازن و تناسب کے ساتھ اپنی اِرتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا جا رہا ہے، تو تم یہ بھی معلوم کر لو گے کہ تمہیں اپنی حیاتِ اجتماعیہ میں اس ہمہ گیر قانون کو کس طرح ایک مؤثر حقیقت بنانا ہے۔ یہی "اللہ کے ذکر" سے مفہوم ہے۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ

> لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (۱۹۰ - ۱۹۱ : ۳)
>
> یہ ایک حقیقت ہے کہ ارض و سماوات کی تخلیق اور رات اور دن کی گردشوں میں اربابِ دانش و بینش کے لئے (قانونِ خداوندی کی محکمیت اور ہمہ گیری کے) نشانات ہیں۔ وہ اربابِ دانش جن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کھڑے، بیٹھے، لیٹے، ہمیشہ قانونِ خداوندی کو سامنے رکھتے ہیں، ارض و سماوات کی تخلیق پہ غور کرتے رہتے ہیں اور اس انداز کے گہرے تدبّر و فکر کے بعد اس حقیقت کو اپنے سامنے مشہود دیکھ لیتے ہیں کہ اللہ کے نشوونما دینے والے قانون نے کائنات کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ تخریبی پہلو (تعمیری پہلوؤں پر) غالب آجائے اور اس طرح اس دنیا کو جہنّم بنا دے۔ خدا کا تعمیری پروگرام ایسے تخریبی مآل سے کوسوں دور ہے۔

اس نے یہ حقیقت بھی ان کے سامنے واضح کر دی تھی کہ جو لوگ غور و فکر سے کام لیتے ہیں، وہ اگر تعداد میں تھوڑے بھی ہوں، تو بھی ان لوگوں کی اکثریت پر غالب رہتے ہیں جو سمجھ سوچ سے کام نہیں لیتے۔

وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا
بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ (۸ : ۶۵)

اگر تم میں سو آدمی بھی ایسے ہو گئے (جو سمجھ بوجھ
سے کام لینے والے ہوں) تو وہ ہزار کافروں کو مغلوب
کر کے رہیں گے' اس لئے کہ کافروں کا گروہ ایسا ہے
جو سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیتا۔

یہ ہے دنیا میں قوموں کی کامیابی کا راز[1]۔ جب تک مسلمانوں کے سامنے قرآن کی یہ تعلیم رہی' انہوں نے اشیائے فطرت پر غور و فکر کرنا اور کائنات کی قوتوں کو اپنا تابعِ فرمان بنانا فریضۂ زندگی سمجھا' لیکن جب مذہب کے تقلیدی فکر نے انکے قوائے فکریہ کو مفلوج کر دیا تو عقل و فکر سے کام

---

[1] قرآن نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ فطرت سے متعلق علم کو اگر مستقل اقدارِ سماوی (وحی) سے ہم آہنگ نہ کیا جائے' تو اس کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوتا ہے۔ سورۃ مومن میں ان اقوامِ سابقہ کے متعلق جو قوتوں اور ثروتوں کی مالک تھیں' فرمایا کہ فلما جاء تھم رسلھم بالبینت فرحوا بما عند ھم من العلم جب ان کے پاس ہمارے فرستادہ واضح دلائل لے کر آئے' تو انہوں نے یہ کہہ کر (منہ پھیر لیا) کہ جو کچھ ہمیں ہمارے علم نے دے رکھا ہے' ہم اس پر مطمئن ہیں"۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وحاق بھم ما کانوا بہ یستھزءون (۴۰ : ۸۳) ان کو تباہیوں نے آ دبوچا جنہیں وہ ایک استحقار آمیز ہنسی سے ٹال دیا کرتے تھے۔ لہٰذا' دین کا نظام یہ ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے ان کا استعمال مستقل اقدارِ سماوی (وحی) کے مطابق کیا جائے۔

لینا ان پر حرام ہو گیا۔

عالم کسے کہتے ہیں؟

قرآن نے عالم کا لفظ ان معنوں میں استعمال کیا تھا جن معنوں میں آج کل سائنٹسٹ (Scientist) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

سورۃ فاطر میں دیکھئے کس طرح یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے فرمایا:

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً

کیا تم اس پر غور نہیں کرتے کہ اللہ کا قانون بادلوں سے پانی برساتا ہے؟

فَاَخۡرَجۡنَا بِہٖ ثَمَرٰتٍ مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُہَا

اور اس پانی (اور مٹی کے امتزاج) سے مختلف اقسام کے پھل پیدا کرتا ہے۔

وَمِنَ الۡجِبَالِ جُدَدٌۢ بِیۡضٌ وَّحُمۡرٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُہَا وَ غَرَابِیۡبُ سُوۡدٌ ۝

اور پہاڑوں میں سرخ و سپید مختلف رنگوں کے خطے ہیں اور بعض ان میں سے (سنگِ موسیٰ کی سی) سیاہی لئے ہوئے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالۡاَنۡعَامِ مُخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُہٗ

(نباتات و جمادات کی دنیا سے آگے بڑھئے تو انسانوں اور حیوانوں کی دنیا میں غور کیجئے کہ یہ کس قدر انواع و اقسام کی دنیا ہے۔

كَذٰلِكَ ۗ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۗ

(۳۵ : ۲۷ - ۲۸)

> یہ کائنات اسی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ سو جو لوگ اس پر غوروفکر کے بعد' اس کے متعلّق معلومات بہم پہنچا لیتے ہیں' وہی قانونِ خداوندی کی عظمت و کبریائی کا صحیح احساس کر کے اس کی خلاف ورزی سے لرزتے ہیں۔

غور کیجئے! یہاں "علماء" کا لفظ استعمال ہی ان کے لئے ہوا ہے جو کائنات کے مختلف شعبوں پر غوروفکر کرتے ہیں (اسی کو سائنس کہتے ہیں)۔ لہٰذا' اس کا ترجمہ سائنٹسٹ ہے جو اپنی تحقیقات کے ماحصل کو وحیٔ خداوندی کے مطابق نوعِ انسان کی بہبود کے لئے استعمال کرے۔ لیکن جب دین' مذہب میں تبدیل ہو گیا' تو علماء کے معنی "لائبریرین" کے رہ گئے۔ آپ شاید حیران ہوں گے کہ میں نے مذہبی علماء کو لائبریرین کس طرح کہہ دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں سب سے بڑا عالم کون ہوتا ہے؟ وہ جو یہ بتا سکے کہ فلاں مسئلہ کے متعلق بخاری میں کیا لکھا ہے' فتح الباری نے اس کی تفسیر میں کیا بیان کیا ہے' علّامہ آلوی کا اس باب میں کیا ارشاد ہے' دُرِّ مختار میں اس کی بابت' حواشی سعدیہ اور بدائع سے کیا منقول ہے۔ صاحبِ نہایہ نے ذخیرہ سے کیا نقل کیا ہے۔ ابنِ کثیر نے البدایہ والنہایہ میں کیا ارشاد فرمایا ہے۔ علّامہ شامی نے شیخ ابن ہمام سے کیا نقل کیا ہے۔ جو سب سے زیادہ حوالے دے سکے' وہی سب سے بڑا "مفتیٔ دین" اور "حاملِ شرعِ

متین" ہوتا ہے۔ یہ لائبریرین کا کام نہیں تو اور کیا ہے۔ چونکہ مذہب کی دنیا میں کسی معاملہ میں اپنی رائے کو دخل دینا سب سے بڑا جرم ہے، اس لئے سب سے زیادہ صحیح جواب وہ ہوگا جس میں کہیں عقل کی بُو نہ آنے پائے اور یہ مسائل جن کے لئے ذخائرِ کتب کی اوراق گردانی و سطور شماری ہوتی ہے، ہوتے کس قسم کے ہیں؟ ایک دوست حج کیلئے عازم ہوئے، تو میں نے خاص طور پر ان سے کہا کہ وہ وہاں مختلف ممالک کے "علماء" سے ملیں اور دیکھیں کہ وہ کن مسائل و مذاہب پر گفتگو کرتے ہیں۔ واپسی پر میں نے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ وہ کم و بیش تمام علمائے مکّہ و مدینہ اور دیگر ممالکِ اسلامیہ سے مل کر آئے ہیں۔ جن مسائل پر سب سے زیادہ گفتگو رہی، وہ یہ تھے **جمع بین الصلوٰتین بالقصر فی عرفۃ والمزدلفہ** عرفات اور مزدلفہ میں نمازوں میں قصر بالجمع جائز ہے یا نہیں؟ قبروں میں نماز پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں۔ سب سے زیادہ مرکوزِ توجّہ یہ مسئلۂ عظیم تھا کہ لاؤڈ سپیکر پر نماز پڑھائی جا سکتی ہے یا نہیں۔ شیخ عبدالظاہر (امام حرم) اور شیخ عبدالمہیمن ابوالسمح (امام حرم) اور شیخ عبدالرزاق مدیر مدرسہ دارالحدیث مکّہ مکرمہ اور مولانا شیخ عبدالرزاق العفیفی الازہری، جیسے "علماء کبار" سب کے سب، اسی اہم مسئلہ پر بحث کرتے تھے۔ ڈاڑھیوں کے متعلق بھی گفتگو تھی اور میز پر کھانا کھانے کے متعلق بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب "امورِ دنیا" کو دنیا داروں کے سپرد کر دیا جائے، تو اہلِ مذہب کے لئے اور کون سے مسائل رہ جاتے ہیں جن پر گفتگو کی جا سکے۔ ان "علماء" میں ایک گروہ ان کا بھی ہے جو اپنے آپ کو "غیر مقلّد" کہتا ہے۔ اس سے ناواقف لوگوں کو

شُبہ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ شاید عقل و فکر سے کام لینے کے مدّعی ہوں گے، لیکن یہ شُبہ ناواقفیت کی بناء پر ہے۔ مقلّد اور غیر مقلّد فرقہ بندی کی اصطلاحیں ہیں۔ عقل و فکر سے دونوں کو کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ مقلّد، آئمہ فقہ کی تقلید کرتے ہیں اور غیر مقلّد، روایات کی تقلید۔ مقلّدِ آئمہ ہوں یا مقلّدِ روایات، تقلید کی تائید میں ان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ ہم صحابہ کبارؓ یا آئمہ فقہ کا اتّباع کرتے ہیں۔ یہ کہتے وقت اتنا نہیں سوچتے کہ صحابہ کبارؓ یا ائمہ فقہؒ تو کسی کے مقلّد نہیں تھے۔ وہ تو مسائلِ زندگی کا حل خود سوچتے تھے۔ لہٰذا، ان کا اتّباع تو یہ ہے کہ آپ بھی اپنے مسائلِ زندگی کا حل اسی طرح خود سوچئے جس طرح وہ حضرات خود سوچا کرتے تھے، یعنی حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے مسائلِ زندگی کا حل۔

غور کیجئے کہ جس قوم کی یہ حالت ہو کہ ہزاروں برس سے اس نے سوچنا ترک کر رکھا ہو، کیا اس قوم میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت باقی رہ سکتی ہے؟ آبائی مسلک کا اثر کس قدر غیر مرئی بلکہ غیر محسوس اور کس درجہ گہرا اور تحت الشعور میں جاگزیں ہوتا ہے، اس کا اندازہ مختلف مثالوں سے لگ سکتا ہے۔ ایک مسلمان بچّہ گوشت کی طرف لپک کر جائے گا، لیکن وہی گوشت ایک جینی لڑکے کے سامنے لائیے، اُسے اِس سے جھرجھری آجائے گی اور اس کی طبیعت متلانے لگے گی۔ اس کی طبیعت کا ایسا ردِّ عمل کسی عقلی فیصلہ کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ طبیعت کا یہ ردِّ عمل یکسر غیر شعوری ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان کو دیکھئے۔ قرآن نے جن چیزوں کو حرام قرر دیا ہے، ان میں ایک وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (۲ : ۱۷۳) بھی ہے، یعنی ہر

وہ شے جسے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کیا جائے۔ ہمارے ہاں پیروں اور اولیاؤں کی نیازیں روز دی جاتی ہیں۔ غیر اللہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ان کی حرمت بہ نصِ صریح ثابت ہے۔ لیکن چونکہ ہمارے گھروں میں ان کا عام رواج ہے' اس لئے ان نیازوں کو چھوٹے بڑے سب کھاتے ہیں اور طبیعت پر اس کا کوئی ناخوشگوار اثر نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس 'چوہا چونکہ کھایا نہیں جاتا' اگر وہ کھانا کھاتے وقت سامنے سے گزر جائے یا اس کا ذکر تک بھی آجائے تو متلی ہونے لگ جاتی ہے۔ حتّٰی کہ اگر کسی کے شراب کے پیالے میں چوہیا گر جائے' تو پینے والے کے نزدیک وہ شراب بھی "حرام" ہو جاتی ہے۔ یہ سب کچھ غیر شعوری طور پر ہوتا ہے اور اس باب میں آپ کا ذہن کبھی اس طرف آنے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا کہ اس کے متعلّق آپ کی طبیعت کا ردِّ عمل سوچ سمجھ کا نتیجہ ہونا چاہیے۔

انہی مثالوں سے اس حقیقت پر غور کیجئے کہ جب ایک قوم اپنے آباؤ اجداد کے مسلک پر تقلیدًا چلی جا رہی ہو' تو واقعات و حوادث کے متعلّق ان کا ردِّ عمل کسی غور و تدبّر کا نتیجہ نہیں ہو سکتا' بلکہ ان کا ردِّ عمل یکسر غیر شعوری ہوتا ہے۔ یہ لوگ جس بات کو غیر شعوری طور پر مستحسن مانتے چلے آرہے ہوں' وہ مستحسن نظر آتی ہے اور جسے غیر شعوری طور پر مذموم سمجھتے چلے آرہے ہوں' وہ مذموم ہوتی ہے۔ نہ اسے مستحسن سمجھنے کے لئے ان کے پاس کوئی حقیقی دلیل ہوتی ہے' نہ اسے مذموم سمجھنے کے لئے کوئی بُرہان۔ اِنہیں' مناظروں اور مباحثوں کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اپنے

مسلک کی "حقانیت" کے لئے دلائل تراشنے پڑتے ہیں۔ لیکن مناظرہ ہمیشہ فریقین کی ذاتی قابلیتوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ہر فریق اس "ایمان" کے ساتھ سامنے آتا ہے کہ اس کا مسلک حق و صداقت کا مسلک ہے اور فریقِ مقابل کا مسلک غوایت و ضلالت کی روش۔ اس "ایمان" کے بعد، ذاتی قابلیتوں کا تقابل ہوتا ہے اور بس۔ جو زیادہ باتیں کرنا جانتا ہو، وہ میدان مار لیتا ہے۔ اب مناظروں کا زور کم ہو گیا ہے تو اس کی جگہ پروپیگنڈا نے لے لی ہے۔ جس گروہ کے پاس پروپیگنڈا کے اسباب و وسائل زیادہ ہوں، وہ دوسروں پر غالب آجاتا ہے۔ قرآنی حقائق اور علم و عقل کا سوال نہ پہلے تھا، نہ اب ہے۔

مذہب پرست مسلمان کی یہ حال ہزار برس سے ہو رہی ہے۔ سوچئے کہ ان حالات میں فکرِ نو کا، جس پر قوموں کی زندگی کا انحصار ہے، کہیں امکان بھی ہو سکتا ہے؟۔

معنیٔ تازہ کہ جوئیم و نیابیم کجا ست؟
مسجد و مکتب و میخانہ عقیم اند ہمہ

صدیوں کی تقلید سے مسلمانوں کا ذہن مساجد کے حجروں اور خانقاہوں کے غاروں کی طرح تاریک ہو چکا ہے، جس میں عقل کی روشنی کی کوئی شعاع کہیں سے بار نہیں پا سکتی۔ مسلمان کی آج حالت یہ ہے کہ۔

پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق
مکتب و ملائے اُو محروم شوق

جب کسی قوم کا ذہن اس طرح تاریکیوں میں گھرا ہوا ہو، تو اسے عروج و

ارتقاء کی راہیں نظر کس طرح آسکتی ہیں؟ اس کی تو حالت یہ ہوتی ہے کہ:

أَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ
مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ
يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ
مِنْ نُّوْرٍ (۲۴ : ۴۰)

جیسے سمندروں کی گہرائیوں میں تاریکیوں کی لہر پہ لہر چڑھتی آرہی ہو۔ آسمان پر گھنگھور گھٹا چھا رہی ہو۔ اندھیرا ہے کہ اندھیرے کے اُوپر چڑھے جا رہا ہے۔ ایسا اندھیرا کہ اپنا ہاتھ باہر نکالئے‘ تو وہ بھی دکھائی نہ دے (یعنی دوسروں کا صحیح مقام متعین کرنا تو ایک طرف‘ خود اپنا مقام بھی دکھائی نہ دے) دکھائی کیسے دے؟ دکھائی تو دینا تھا دین کی روشنی سے‘ جب دینِ خداوندی سے روشنی نہ لی جائے‘ تو روشنی کہاں سے ملے؟ مذہب خود تاریکی ہے‘ تاریکی سے تاریکی ہی ملے گی‘ روشنی کیسے مل سکتی ہے؟

☆☆☆☆

یہ ہے حالت آج مسلمانوں کی۔ اس کی دنیا‘ ملوکیت کی لعنت میں گرفتار ہے۔ بادشاہتیں‘ سرمایہ داریاں‘ جاگیرداریاں‘ زمینداریاں‘ غرضیکہ معاشرتی اور معاشی زندگی کی تمام ناہمواریاں (جسے قرآن نے فساد فی الارض کہہ کر پکارا ہے) سب اسی لعنتِ کبیرہ کے مظاہر ہیں۔

اور اس کی "آخرت" مذہب کی تاریکیوں میں چھپی ہوئی شریعت کے رسوم و مروّجات، علمِ کلام کے نظری مباحث، تصوّف کی فسوں کاریاں، سب انہی تاریکیوں کے پیدا کردہ چھلاوے ہیں اور ان کے اندر جکڑا ہوا بیچارہ مسلمان، حسرت بھری نگاہوں سے دوسری قوموں کو دیکھتا ہے اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے ؎

آں کہ گوید لاالٰہ بیچارہ ایست
فکرش از بے مرکزی آوارہ ایست
چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر
سود خوار و والی و ملّا و پیر

اب سوچئے کہ اس کے بعد اس کے سینے میں روشنی کی کرن کہاں سے آ سکتی ہے؟

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری

زوال کا بنیادی سبب

یہ ہیں "اسبابِ زوالِ اُمّت"۔ "اسباب" محض تفصیل کے اعتبار سے ورنہ درحقیقت، سبب صرف ایک ہے اور وہ ہے مسلمانوں کا خود ساختہ مذہب۔ مذہب اور دین میں جو فرق پہلے بتایا جا چکا ہے، ایک مرتبہ پھر سامنے لے آئیے تاکہ آپ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ میں (معاذاللہ) لامذہبی یا الحاد (Atheism) کی تعلیم دیتا ہوں۔ دین اس ضابطۂ حیات کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے مکمّل شکل میں اپنی آخری کتاب قرآنِ کریم میں محفوظ کر کے دے دیا اور جسے اس کے آخری نبیؐ

نے عملاً متشکّل کر کے دکھا دیا۔ اس میں نہ ملوکیت تھی نہ سرمایہ داری، نہ پیشوائیت تھی نہ خانقاہیت، نہ فرقہ بندی تھی نہ گروہ سازی، ساری اُمّت ایک ملّتِ واحدہ، اس اُمّت کا ایک نظام، اس نظام کا ایک مرکز، اس مرکز کے فیصلوں کی اطاعت تمام افراد کا فریضہ۔ اس کے برعکس، مذہب ان عقائد و نظریات اور رسوم و اطوار کے مجموعہ کا نام ہے جو خود انسانوں نے وضع کیے۔ اس کا مقصود ہر فرد کی اپنی اپنی نجات، مکتی یا (Salvation) ہے جو مرنے کے بعد حاصل ہوگی، اس دنیا سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔ اس میں ملوکیت، سرمایہ داری، پیشوائیت، خانقاہیت، فرقہ بندی، گروہ سازی سب کچھ ہوتا ہے۔ لہٰذا، اس کتاب میں جہاں بھی آپ کو دین کے مقابلہ میں مذہب کا لفظ نظر آئے اس سے یہی مفہوم لیجئے اور اس فرق کو ہمیشہ سامنے رکھئے تاکہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام ہمیشہ خدا کا دین لاتے تھے، لیکن ان کے نام لیوا، ان کے بعد، اس دین کو مذہب میں تبدیل کر دیتے تھے۔ نبئ اکرمؐ کے ظہورِ قدسی کے وقت دنیا میں دین کہیں نہیں تھا، ہر جگہ مذہب ہی مذہب تھا۔ دینِ اسلام ان مذاہب کے خلاف چیلنج تھا۔ وہ انہیں مٹانے کے لئے آیا تھا تاکہ انسانیت ان زنجیروں سے آزاد ہو کر، صرف قوانینِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرے۔ لیکن حضورؐ کی تشریف براری کے بعد جو کچھ اقوامِ سابقہ نے اپنے اپنے دین کے ساتھ کیا تھا، وہی کچھ ہم نے کیا۔ ہم نے بھی انہی کی طرح دینِ خداوندی کو مذہب میں تبدیل کر لیا، لہٰذا جو کچھ اقوامِ سابقہ کے ساتھ ہوا، وہی کچھ ہمارے ساتھ ہوا (اور ہو رہا ہے)۔

دنیا میں آج تک کسی "مذہب پرست" قوم نے ترقّی نہیں کی۔ نظر دوڑا کر دیکھئے، یہ حقیقت ہر طرف بکھری ہوئی دکھائی دے گی۔ جس قدر کوئی قوم زیادہ "مذہب پرست" ہے، اسی قدر وہ دنیاوی ترقّیوں میں پست و زبوں حال ہے۔ تبّت کے لاموں کے پیرو، پورے کے پورے "مذہب" میں ڈوبے ہوئے ہیں، ان کی حالت ظاہر ہے۔ جن قوموں میں ایک طبقہ "مذہب پرست" ہوتا ہے اور دوسرا "دنیا دار" ان کا "مذہب پرست" گروہ "دنیا دار طبقہ" کے مقابلہ میں پست حالت ہوتا ہے۔ ہندوستان میں سناتن دھرمی فرقہ کبھی آگے نہیں بڑھ سکا۔ خود یورپ میں عیسائی خانقاہوں کے "مذہب پرست" گروہ ہمیشہ پیچھے رہے۔ دنیا کے تھپیڑے رفتہ رفتہ ایسا کردیتے ہیں کہ "مذہب پرست" طبقہ کے افراد ادھر سے کٹ کٹ کر دنیا داروں کی طرف آجاتے ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ، اس قوم کی اکثریت "دنیا داروں" کی ہو جاتی ہے اور مذہب عبادت گاہوں کی چار دیواری میں سمٹ کر رہ جاتا ہے، جیسے آج کل یورپ میں عام طور پر ہو رہا ہے۔ جب یہ تھپیڑے اور شدّت اختیار کر لیتے ہیں، تو مذہب کو خارج البلد کر دیا جاتا ہے اور پوری کی پوری قوم "خالص دنیا دار" ہو جاتی ہے، جیسے روس میں ہوا ہے۔ یہی حالت مسلمانوں کی ہے۔ ان کی اکثریت "مذہب پرست" ہے اس لئے پست و زبوں حال۔ جو کچھ مذہب نے دوسری جگہ کیا ہے، وہی کچھ ان کے ساتھ ہوا ہے، اور ہو رہا ہے۔ دیکھئے اس حقیقتِ کبریٰ کو قرآن کریم نے کیسے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کا پیغام نوعِ انسانی کے لئے یکسر ہدایت و رحمت ہے لیکن:-

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا (۲ : ۲۶)

اسی قرآن سے بہت سے لوگوں کو ہدایت ملے گی اور بہت سوں کے حصّے میں گمراہی آئے گی۔

☆☆☆

قرآن ہی کے قانون کے مطابق تباہی

اس آیت جلیلہ پر غور کیجئے۔ خدا کہتا ہے کہ اسی قرآن سے بہت سے لوگوں کے حصّہ میں گمراہی آئے گی۔ وہی پانی جو زندگی کی اساس ہے ' انسان کی موت کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ یہ کون ہیں جن کے حصّہ میں اس قرآن سے بربادی اور تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ **وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ** (۲ : ۲۶) گمراہی فاسقین کے حصّے میں آئے گی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ فاسقین کون ہیں ؟ وہ کہتا ہے۔ **الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ** وہ لوگ جنہوں نے قانونِ خداوندی کے مطابق نظامِ حیات قائم کرنے کا عہد کیا' لیکن اس کے بعد اس عہد کو توڑ دیا"۔ اس کی مزید وضاحت ان الفاظ میں فرما دی کہ **وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ** (۲ : ۲۷) "ہاں یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس چیز کو الگ الگ کر دیا جسے ملا کر رکھنے کا حکم خدا نے دیا تھا"۔ خدا کے قانون نے یہ بتایا تھا کہ حیات ایک غیر منقطع وحدت ہے 'طول میں بھی اور عرض میں بھی۔ طول میں دنیا اور آخرت' حال اور مستقبل میں کوئی حدِّ فاصل نہیں۔ یہاں سے وہاں تک ایک مسلسل جوئے رواں چلی جاتی ہے۔ اس لئے دنیا اور آخرت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرکے ان کے لئے الگ الگ ضوابطِ زندگی تجویز کرنا' فسق ہے' شرک ہے۔ اسی

طرح عرض کی طرف وحدتِ انسانیت کے بجائے انسانوں کو افراد' شعوب' قبائل' اقوام میں تقسیم کر کے حد بندیاں قائم کر دینا بھی اس وحدت کا قطع کر دینا ہے اور یہ فسق ہے۔ اس فسق و شرک کا عملی نتیجہ یہ ہو گا کہ زندگی میں ناہمواریاں پیدا ہو جائیں گی (**وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ**) اور ایسی قوم کا انجام یہ ہو گا کہ وہ سخت ناکام و نامراد رہے گی **أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ** (۲ : ۲۶ ـ ۲۷)

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے ان مختصر سی آیات میں کیسے اہم اساسی قانونِ زندگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دین کا نظام' حیات کی وحدت کو عملاً قائم رکھنے کے لئے آیا تھا۔ یہ وہ نظام تھا جس کا نتیجہ اصلاح فی الارض (انسان کی تمدنی زندگی میں ہمواریاں) اور حسن مآب' مستقبل کی خوشگواریاں تھا۔ یہ صحیح راستہ (ہدایت) تھا۔ اس کے بعد' قرآن کی حامل قوم نے اس وحدت کے ٹکڑے کر دیئے اور اس کے ساتھ ہی قرآن کے بھی ٹکڑے کر دیئے۔ اس کا نتیجہ **فساد فی الارض** (حال کی تباہی) اور **خسران فی الاخرہ** (مستقبل کی بربادی) تھا۔ اس کا نام قرآن کی اصطلاح میں ضلالت ہے۔ قرآن وہی تھا' لیکن جب اس قرآن کو لوگوں نے اپنی مرضی کے تابع رکھ کر اسے اپنے خیالات کے مطابق استعمال کرنا شروع کر دیا' تو وہ سرچشمۂ ہدایت ہونے کے بجائے ان لوگوں کے لئے گمراہی کا موجب بن گیا' یعنی یہ لوگ بجائے اس کے کہ قرآن کو اپنا راہنما سمجھتے' اسے اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بنا بیٹھے۔ اس کا نتیجہ گمراہی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ دین میں قرآن ضابطۂ حیات تھا۔ ”مذہب“ میں

پہنچ کر قرآن مُردوں کو ثواب پہنچانے کا ذریعہ بن گیا۔ ہزار برس سے یہ قوم، بظاہر قرآن کو سینے سے لگائے پھر رہی ہے، لیکن اس قرآن سے انہیں، سوائے ضلالت اور خُسران کے، اور کچھ نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ کائنات کا قانون یہ ہے کہ ہر شے اپنے اصلی مقام پر ہی اپنے مضمر فوائد سے متمتّع کر سکتی ہے۔ اسے اس کے صحیح مقام سے ہٹا دیجئے، وہی شے ضرر انگیز ہو جائے گی۔ پانی کو کشتی کے نیچے رکھئے، وہی پانی کشتی کی روانی کا ذریعہ ہوگا۔ اسے کشتی کے اوپر لے آیئے، وہی پانی سیلاب بن کر کشتی کو لے ڈوبے گا۔ کسی شے کو اس کے صحیح مقام سے ہٹا دینا قرآن کی اصطلاح میں ظلم کہلاتا ہے۔ اس لئے قرآن نے بتا دیا کہ ظالمین کے لئے قرآن میں ناکامی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں **وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔** اور ہم نے قرآن میں جو کچھ نازل کیا ہے، وہ ایمان والوں کے لئے شفاء و رحمت ہے **وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا** (۱۷ : ۸۲) لیکن جو اسے اس کے صحیح مقام سے ہٹا دیں گے، ان کے لئے اس میں خسارہ کے سوا کچھ نہیں۔ مسلمان کے کاروبارِ زندگی میں جو چیز گھاٹے کا موجب بن رہی ہے وہ، وہ قرآن ہے جسے اس کے صحیح مقام سے ہٹا دیا گیا ہے۔ قرآن جب اپنے حقیقی مقام پر تھا تو دین کہلاتا تھا اور جب اس مقام سے ہٹ گیا تو اس کا نام مذہب ہوگیا۔ قرآن وہی ہے اس کا مقام بدل گیا ہے:

اسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز

تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

☆☆☆

اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سمجھ لیجئے کہ اس آیت کا (جس سے یہ بات شروع کی گئی ہے) یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں لوگوں کو ہدایت بھی قرآن ہی سے ملتی ہے اور گمراہی بھی قرآن ہی سے ----- قرآن تو سر تا سر ہدایت ہے، نور ہے۔ اس سے ہدایت ہی مل سکتی ہے، گمراہی نہیں۔ اس نے کہا یہ ہے کہ جب قرآن کو دین کا ضابطہ سمجھا جائے اور اس کے تابع زندگی بسر کی جائے، تو اس سے انسان کو ہدایت ملتی ہے۔ لیکن جب اسے محض "مذہب" کی کتاب سمجھ لیا جائے جس کا مقصد مردوں کو ثواب پہنچانا ہو، تو اس طرح قرآن کو اس کے مقام سے ہٹا دینے والی قوم کے حصے میں گمراہی کے سوا کچھ نہیں آسکتا۔ جو کچھ قرآن میں بیان ہوا ہے، اسے اس کے صحیح مقام پر رکھ کر سمجھئے، اس کا نتیجہ ہدایت ہوگا۔ لیکن اگر اسے اس مقام سے ہٹا کر اپنے معتقدات اور نظریات کے تابع رکھ دیا جائے تو اس کا نتیجہ گمراہی ہوگا۔ مسلمان کے ساتھ یہی ہو رہا ہے۔ اس نے قرآن کو اس کے صحیح مقام پر نہیں رکھا اور اس کا نتیجہ بھگت رہا ہے۔

اسبابِ زوال آپ کے سامنے آگئے اور اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس زوال کو عروج سے بدلنے کی راہیں کون سی ہیں۔ بات صاف

ہے۔ اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات اس وقت ہماری قوم کی سمجھ میں شاید ہی آئے۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیئے

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ۔

(i) قوموں کی زندگی اور عروج کے راستے میں سب سے بڑا روڑا "مذہب" ہوتا ہے۔

(ii) کوئی قوم ترقّی نہیں کر سکتی جب تک وہ "مذہب" کو نہ چھوڑے۔

(iii) دنیا کی دیگر اقوام نے جب ترقّی کی طرف قدم اُٹھانا چاہا تو انہوں نے مذہب کو چھوڑ دیا۔ چونکہ ان کے پاس خدا کی طرف سے دیا ہوا دین نہیں تھا' اس لئے ان میں سے بعض نے:

(ا) مذہب کو مندر یا گرجا کی چار دیواری میں محدود کر دیا اور دنیا کے معاملات' اپنی مصلحتوں کے مطابق طے کرنے شروع کر دیئے۔ اسے سیکولرازم کہتے ہیں اور یا

(ب) انہوں نے مذہب کو بالکل خیر باد کہہ دیا۔ یہ بھی سیکولرازم ہی ہے۔

(iv) مسلمانوں کے پاس خدا کا دین اس کی اصلی شکل میں' قرآنِ کریم کے اندر موجود ہے۔ اس لئے اگر انہوں نے زندگی اور عروج حاصل کرنا ہے' تو انہیں موجودہ مذہب کی جگہ خدا کا دین اختیار کرنا

ہو گا۔

(v) لیکن اگر ہمارا مذہب پرست طبقہ اپنی ضد پر اَڑا رہا اور قوم سے یہی کہتا رہا کہ دین وہی ہے جو ان کے ہاں اس وقت رائج ہے‘ تو اس کے بعد‘ دو شکلوں میں سے ایک شکل پیدا ہو کر رہے گی یعنی:

(ا) یا یہ قوم بالکل تباہ ہو جائے گی اور

(ب) یا یہ بھی مذہب کو مسجدوں کی چار دیواری میں محدود کر کے اپنے ہاں سیکولرازم رائج کر لے گی۔

دونوں صورتوں میں‘ دین ان کے ہاں نہیں رہے گا۔ سیکولرازم سے دنیاوی مفادِ عاجلہ تو انہیں میسّر آجائیں گے‘ لیکن یہ بھی‘ مغربی اقوام کی طرح‘ بین الاقوامی جہنّم میں زندگی بسر کرے گی۔

آپ ان دونوں راستوں پر ایک مرتبہ پھر غور کیجئے جن کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے‘ یعنی خالص سیاست کی راہ جسے (Secularism) کہا جاتا ہے اور یا خالص دین کی راہ۔ یہ ہیں وہ دو راہیں جو “خود ساختہ مذہب” کو چھوڑ کر اختیار کی جا سکتی ہیں۔ اگر ہم مزید ذلّت و خواری سے بچنا چاہتے ہیں‘ تو ہمیں بہر حال‘ اپنا موجودہ (خود ساختہ) “مذہب” چھوڑنا ہو گا اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ ہم نے خالص دُنیا (قریبی مفاد) کی راہ اختیار کرنی ہے یا حال و مستقبل‘ دونوں کی درخشندگی کی دینی راہ۔ اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ ہماری اکثریت اپنی موجودہ پستی و زبوں حالی میں مگن ہے۔ وہ اپنی افیون کی پینک (غنودگی) سے باہر آنا ہی نہیں چاہتی‘ بلکہ بالفاظِ صحیح‘

یوں کہئے کہ انہیں اس حالت میں مگن رکھا جاتا ہے اور انہیں پیہم افیون پر افیون کھلائی جا رہی ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں اقوام عالم کی دیکھا دیکھی اس پستی سے نکلنے کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ لیکن چونکہ صحیح راہ ان کے سامنے بھی نہیں، اس لئے وہ موجودہ خود ساختہ مذہب کے اثرات سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ان کی کوشش یہ ہے کہ امور دنیا کے ساتھ کچھ اخلاقی اصول اور کچھ مسلمانوں کے سابقہ ادوارِ حکومت کے تعزیری قوانین (فقہی قوانین) اس طرح شامل کر لئے جائیں کہ ہماری حکومتیں "اسلامی" بن جائیں۔ چنانچہ ان کے سامنے "اسلامی حکومتوں" کا نقشہ ہارون الرشید اور مامون الرشید کے زمانے کا بھڑکیلا تمدن ہے لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس قسم کی پیوند سازی سے یہ نظام کبھی دینی نظام نہیں بن سکتا۔

اسلامی حکومتوں کی پیوند سازی

ہائیڈروجن اور آکسیجن کو ایک بوتل میں بند کر دینے سے پانی نہیں بن جایا کرتا۔ اس امتزاج کے لئے کیمیاوی عمل کی ضرورت ہے۔ اس عملِ کیمیاوی کے بغیر، ایک ظاہری "اتحاد" تو پیدا ہو جاتا ہے، حقیقی ائتلاف[1] کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کے ظاہری اور خارجی پیوند کا نتیجہ اُلٹا خُسران ہوتا ہے۔ قرآن، کفرِ خالص کو بھی نتیجہ خیز بتاتا ہے۔ اس سے کم از کم قریبی مفاد تو حاصل ہو جاتے

---

[1] قرآن اتحاد کے لئے ائتلاف کا تقاضا کرتا ہے (الف بین قلوبھم) اتحاد، دو اجزاء کا ایک جگہ جمع ہو جانا ہے، ائتلاف ان کا ایک دوسرے میں ضم ہو جانا بایں نمط کہ وہ ایک بھی ہو جائیں اور اپنی انفرادیت بھی نہ کھوئیں۔ بلکہ وہ ایک ہوتے ہی اپنی انفرادیت کو مستحکم کرنے کے لئے ہیں۔

ہیں اور دینِ خالص کو بھی نتیجہ خیز (جس میں حال اور مستقبل دونوں روشن ہو جاتے ہیں)۔ لیکن وہ "کفر اور دین کی" اس قسم کی امتزاجی کوشش کو نیم صداقت یعنی منافقت قرار دیتا ہے جس میں کوئی کوشش بھی بار آور نہیں ہوتی۔ سورۃ بقرہ کی اس آیت کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے جو اس سے پیشتر درج کی جا چکی ہے۔ بات واضح ہو جائے گی۔

> أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (۸۵ : ۲)
>
> کیا تم ایسی زندگی اختیار کرنا چاہتے ہو جس میں قانون کی بعض شقوں کو اختیار کر لو اور اس کے دوسرے حصوں کو الگ رکھ دو۔ یاد رکھو! جو قوم بھی اس قسم کی روش اختیار کرے گی، اس کی اس کوشش کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہوگا کہ اسے حال کی زندگی میں بھی ذلّت و رسوائی نصیب ہوگی اور اس کے بعد بھی سخت سزا ملے گی۔

قرآن، دین کے نظام کو خالصتاً اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے "شرعی" انداز سے نہیں۔ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ (۲ : ۳۹)

یہ ہے میرے نزدیک صحیح راہِ عمل، یعنی ہمارے ہاں جو کچھ مذہب کے نام سے پیش کیا جاتا ہے، اسے قرآنِ کریم کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لیا جائے۔ جو اس امر پر پورا اُترے، اسے دینِ خالص سمجھ کر رکھ لیا جائے۔

جو اس کے خلاف جائے' اسے مُسترد کر دیا جائے' خواہ اس کی نسبت کسی کی طرف بھی کیوں نہ رکھی ہو۔ دینِ خالص' خدا کی آخری اور مکمل کتاب کے اندر ہے۔ اس کے سوا ہمارے لئے نجات و سعادت کی کوئی راہ نہیں۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے' سرِدست' بہت کم لوگ اس کی تہہ تک پہنچ سکیں گے (تاوقتیکہ وہ اس کا مطالعہ خالی الذّہن ہو کر نہ کریں) اور جو اسے سمجھ سکیں گے' ان میں سے بھی بہت کم ایسے ہوں گے جو اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے اپنے اندر آمادگی پائیں۔ سمجھ اس لئے نہیں سکیں گے کہ انسانوں کا خود ساختہ مذہب اپنے اعتقادات و رسوم کو اس قدر مقدّس بنائے رکھتا ہے کہ انسان اس کے خلاف ایک لفظ تک سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ کسی ملحد سے بات کیجئے' تو وہ کم از کم عقلی دلائل تو سُنے گا' لیکن "مذہب پرست" گروہ عقل کو پاس تک نہیں پھٹکنے دے گا اور جو کچھ اس تک تقلیدی وراثت سے پہنچ چکا ہے' اسے کسی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے قطعاً تیار نہیں ہوگا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

أَفَمَن زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَنًا فَإِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَن
يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ (۳۵ : ۸)

جس کا بُرا عمل اس کیلئے خوشگوار بن جائے اور اسے
نہایت حسین دکھائی دے' کیا وہ بھی کسی سیدھے
راستے پر آسکتا ہے؟ یہ ہے وہ قانونِ مشیت جس کے
مطابق گمراہی اور ہدایت کا فیصلہ ہوتا ہے۔

جو شخص کسی بات کو غلط سمجھے' اس کے راہِ راست پر آجانے کی توقع ہو سکتی ہے' لیکن جو اسے سمجھے ہی بالکل صحیح' تو وہ اسے کس طرح چھوڑ سکتا ہے۔ اسی لئے رسول اللہؐ کو ارشاد ہوا کہ:

> **فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ** (۳۵ : ۸)
>
> جن لوگوں کی یہ کیفیت ہو چکی ہو' تو انہیں راہِ راست پر لانے کی فکر میں اپنی جان کیوں ہلاک کرتا ہے؟

اور سمجھ جانے کے بعد عمل کرنا اس لئے دشوار ہوتا ہے کہ اس راہ میں ایسے ایسے معبود (**انداداً من دون اللہ**) کھڑے ہوتے ہیں جن کا خود اپنے ہاتھوں سے توڑنا کسی خلیلِ اکبر ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ نیز یہ کہ انسانوں کے خود ساختہ مذہب کی راہ ایسی تن آسانی کی راہ ہوتی ہے کہ اسے چھوڑ کر دین کی پیہم سعی و عمل کی راہ پر چلنا گویا لوہے کے چنے چبانا ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ دین کی مخالفت ہمیشہ مترفین (تن آسان لوگوں) کی طرف سے ہوتی ہے۔ دین کے نظام میں ان کی تن آسانی اور عیش پسندی کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ مجھے ان تمام باتوں کا احساس ہے' لیکن بایں ہمہ' میری قرآنی بصیرت نے مجھے جس نتیجہ پر پہنچایا ہے' اسے میں نے کاغذ پر محفوظ کر دینا ضروری سمجھا ہے' کہ آج نہیں تو آنے والی نسلوں میں شاید کوئی اس سے مستفید ہو سکے۔ اگر اس وقت کوئی قرآن پر غور کرنے والا' اس راستے پر چل نکلا تو اسے' میرے پاؤں کے نشانات دیکھ کر کم از کم اتنا اطمینان تو ہوگا کہ اس سے پہلے اس راہ سے کوئی اور بھی گزرا ہے۔

اور اگر میرے مخاطبین میں ایسے اربابِ فکر و نظر موجود ہیں جو میرے ان نتائجِ فکر قرآنی سے متفق ہیں، تو مجھے اس سے بڑی مسرت ہوگی اگر وہ مجھے اس سے مطلع فرمائیں۔ کیونکہ دنیا میں جو رشتہ قرآنی فکر و نظر کی ہم آہنگی و یک رنگی سے ہوتا ہے، اس سے زیادہ محکم رشتہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے اس ربطِ باہمی سے ہم اس مسئلہ پر مزید غور و فکر کرکے راستہ کی دشواریوں میں آسانیاں پیدا کرسکیں اور اس طرح قرآنی بصیرت کی شمعِ عالمتاب سے اُن پردوں کو اُٹھا سکیں جو ہزار برس کی تقلیدی تاریکیوں اور مذہبی ظلمتوں سے اس پر پڑے ہوئے ہیں۔ **لِيُخْرِجَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّوْرِ** (۶۵ : ۱۱) میرا ایمان ہے (اور میرا تجربہ اس ایمان کو محکم تر کرتا جا رہا ہے) کہ جب تک ہم خالص قرآن کو اپنے سامنے نہیں رکھتے، دین کا نظام ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اور ہم کبھی وہ انقلاب پیدا نہیں کرسکتے جو قرآن نے ایک مرتبہ پیدا کیا تھا اور جسے ہر وقت پیدا کرنے کی صلاحیت وہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہی وہ طریقِ کار ہے جو قرآن کی حامل قوم کے ذریعے ساری انسانیت میں ایک حسین انقلاب پیدا کردے گا۔ وہ انقلاب جس میں دنیا یہ حقیقت عملاً سامنے دیکھ لے گی کہ۔

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتہء شرعِ مبیں این است و بس

اس وقت ساری دنیا غیر خداوندی نظامہائے زندگی کے عذاب میں مبتلا ہے۔ اس میں مغرب کی وہ قومیں بھی شامل ہیں جو خدا کو مانتی ہیں، لیکن ان کا

نظام سیکولرازم ہے (مثلاً” مغرب کی جمہوریتیں) اور وہ قومیں بھی جنہوں نے یکسر خدا کی ہستی سے انکار کر دیا ہے (مثلاً” کمیونزم کی علمبردار حکومتیں)۔ انہیں اس جہنّم سے نکلنے کا راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ قرآنی نظام میں یہ قوت ہے کہ وہ انسانیت کو اس جہنّم سے نکال کر‘ جنّتِ ارضی (اور اس کے بعد جنّتِ اُخروی) کی طرف لے جائے۔ اگر ہم نے اس نظام کے قیام کی ابتدا کر دی‘ تو ہم خود بھی موجودہ جہنّم سے نکل سکیں گے اور باقی دنیا کو بھی جنّت کا راستہ دکھا سکیں گے اور اگر ہم نے یہ راستہ اختیار نہ کیا‘ تو خود بھی تباہ ہو جائیں گے اور دیگر اقوام کی تباہی کا بھی موجب بنیں گے۔

خدا کرے میری یہ حقیر سی آواز‘ پُرخلوص دلوں میں اثر انگیزی کا موجب بن سکے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

والسلام

پرویز

استفسارات

(اس مقالہ کی اشاعت کے بعد میرے پاس بہت سے استفسارات موصول ہوئے۔ ان میں سے بعض کے جوابات طلوع اسلام بابت جون ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئے تھے جو اس مقالہ کے چند اہم مقامات کی تشریح کرتے ہیں۔ ذیل میں ان سوالات اور جوابات کو بھی درج کر دیا جاتا ہے' تاکہ اس مقالہ کی مزید وضاحت ہو جائے)۔

سوال نمبر ۱:

آپ نے انسان کی مادی ضروریات کو بڑی اہمیت دی ہے' اس کی روحانی ضروریات کے متعلّق کچھ نہیں لکھا۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ انسان کا منتہیٰ انسان کی معاشی زندگی میں توازن پیدا کرنا ہے اور بس؟

جواب :

انسان کی دنیاوی ضروریات سے مراد صرف روٹی' کپڑا اور مکان نہیں' بلکہ وہ تمام اسباب و ذرائع ہیں جن سے انسان کی طبعی ضروریات بھی پوری ہوں اور اس کے مضمر جوہروں کو کامل نشوونما کا بھی موقع ملے' یعنی افرادِ معاشرہ کی صلاحیتوں کے تکمیل پانے اور برومند ہونے کے لئے مواقع میسّر

ہوں اور اس کے بعد ان صلاحیتوں کو ایک نظام کے تابع ربوبیتِ عامہ کے لئے استعمال کیا جائے۔ ”انسان کی مضمر صلاحیتوں کے برومند“ ہونے سے مفہوم یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جن صفات کو خدا کے اسماء الحسنٰی کہا ہے، وہ (بشریت کی حدود کے اندر) انسان میں بیدار ہوتی جائیں۔ معاشی توازن سے یہی مراد ہے اور میرے نزدیک اسلام کا یہ منشاء ہے۔ کیا کسی نظام کا یہ کارنامہ کم معرکہ آراء، محیّر العقول اور باعثِ فخر و ناز ہے کہ وہ اس قسم کا معاشی توازن قائم کر دے اور اس نظام کا قیام کسی ایک خطّۂ زمین یا انسانوں کے کسی گروہ تک محدود نہ ہو، بلکہ اس کا دائرہ عمل و نفوذ تمام دنیا کے انسانوں کو محیط ہو؟ علاوہ بریں، اگر خالص ”معاشیاتی“ نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے، تو یہ حقیقت ہے کہ ہم صبح سے شام تک معاشی مقاصد کے حصول کی جدّوجہد میں مصروفِ سعی و عمل رہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود معاشی ضروریات کی اہمیت سے انکار کرتے رہتے ہیں۔ یہ انکار دراصل، غمّازی کرتا ہے مادی زندگی کے متعلّق اس تصوّر کی جو عیسائیت کی رہبانیت اور عجمی تصوّف نے ہمارے ذہنوں میں پیدا کر رکھا ہے، جس کی رُو سے ہم مادی دنیا کو قابلِ نفرت سمجھتے ہیں۔ مادی زندگی اور اس کے تقاضے کوئی ایسی شے نہیں جن سے جھینپ محسوس کی جائے۔ عملاً ہماری حالت یہ ہے کہ ہم میں سے بڑے سے بڑا روحانیت کا دعویدار بھی ٹھوڑی تک اسی دنیا کی ضروریات میں غرق ہوتا ہے اور زبان سے ہم میں کا ہر شخص مادی دنیا پر لعنت بھیجتا ہے۔ اسلام اس قسم کی جھجک اور جھینپ کی زندگی کو منافقت کی زندگی قرار دیتا ہے۔ وہ حقائق کا بے نقاب سامنا کرتا ہے اور ہر

حقیقت کا مردانہ وار اعتراف کرتا ہے۔ وہ معاشی خوشگواریوں کو خدا کی نعمتیں قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک معاشی خوشگواریوں کا حصول قابلِ نفرت نہیں، بلکہ قابلِ نفرت وہ نظام ہے، جو ایسی معاشی ناہمواریاں پیدا کرتا ہے جس میں نوعِ انسانی کا بیشتر حصّہ اپنی زندگی کی ابتدائی ضروریات سے محروم رہ جاتا ہے، چہ جائیکہ وہ اپنی انسانی صلاحیتوں کے نشوونما پانے کے اسباب و ذرائع ہر قدم پر موجود پائے۔ قرآن کے نزدیک حُسنِ عمل کا تقاضا ہے کہ وہ اس قسم کے فساد انگیز (یعنی ناہموار) معاشی نظام کو مٹا کر اس کی جگہ عدل اور احسان کا متوازن معاشی نظام قائم کرے۔ فرمایئے کہ جس نظام کا مقصود یہ ہو، آپ کے نزدیک وہ نظام کچھ اہمیت نہیں رکھتا؟ اس نظام کے قیام اور قیام کے بعد بقاء و استحکام کے لئے انسان کو جس قسم کی جدّوجُہد کرنی پڑتی ہے، کیا اس سے بڑھ کر کوئی اور ”روحانیت“ بھی ہو سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ لفظ ”ثواب“ کی طرح ”روحانیت“ بھی ایک ایسا لفظ ہے جو آج تک شرمندۂ معنی نہیں ہو سکا۔ بولنے کو ہر شخص یہ لفظ بولے گا، لیکن پوچھنے پر کوئی نہیں بتا سکے گا کہ اس کا مفہوم کیا ہے؟ وہ بہت دور کی کوڑی لائے گا، تو کسی بزرگ کی کرامات گنا دے گا۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ان ”کرامات“ سے کہیں بڑھ کر محیّر العقول ”کرامات“ ہندو سنیاسیوں اور یوگیوں کے ہاں مل جاتی ہیں۔ لہٰذا، اگر اسلامی تعلیم کا مغز اور منتہٰی اس قسم کی محیّرالعقول کرامات ہیں اور اسی کا نام ”روحانیت“ ہے، تو اس میں اسلام کی کیا خصوصیت ہے، یہ تو غیر مسلموں کے ہاں بھی ملتی ہیں۔ یاد رکھئے! قرآن نے کہیں روحانیت کا مطالبہ نہیں کیا۔ اس کا مطالبہ

"ربّانی" بننے کا ہے اور اس کے معنی ہیں قوانینِ خداوندی کے مطابق نشوونما دینے والے نظام کے حامل۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اس وقت تصوّر ہی نہیں کر سکتے کہ وہ نظامِ عدل و احسان جس میں ہر انسان اپنی تمام صلاحیتوں کے برومند ہونے کے مواقع یکساں طور پر موجود پائے گا، کس قدر "روحانیت پرور" ماحول پیدا کر دے گا۔ یہی وہ ماحول تھا جس کی ایک جھلک آسمان کی آنکھ نے سرزمینِ عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر دیکھی تھی اور جسے دوبارہ دیکھنے کی تمنّا میں وہ آج تک سرگرداں پھر رہا ہے۔

جسے تزکیۂ نفس کہا جاتا ہے وہ کوئی چیستاں نہیں کہ "علمِ لدُنّی" کے بغیر کسی کی سمجھ میں نہ آسکے۔ قرآن (اور عربی زبان) کی رُو سے، تزکیہ کے معنی ہیں بڑھنا، پھولنا، برومند ہونا، یعنی جسے (Development) کہتے ہیں اور نفس کے معنی ہیں انسانی ذات۔ لہٰذا، تزکیۂ نفس کے معنی ہوئے انسانی ذات کی صلاحیتوں کا نشوونما پانا۔ اسی کا نام ربوبیت ہے۔ انسانی صلاحیتوں کی نشوونما، انسانی معاشرہ سے الگ ہوکر، زاویہ نشینی اور خلوت گزینی کے چلّوں سے نہیں ہو سکتی۔ یہ ہو سکتی ہے انسانی معاشرہ کے اندر، معاشرتی زندگی میں۔ انسان کے سامنے نت نئے دن، نئے نئے مسائل اور نئے نئے تقاضے آتے رہتے ہیں۔ انسانی صلاحیتیں ان تقاضوں کے پورا کرنے کے لئے حُسن کارانہ انداز کی سعی و عمل سے جِلا حاصل کرتی ہیں۔ اسی کش مکش سے یہ بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ کسی شخص کی صلاحیتیں کس قدر نشوونما پا چکی ہیں۔ **محمد رسول الله والذین معه** نے اپنی "روحانیت" نہیں بڑھائی تھی۔ "روحانیت" بڑھانے کا وہ طریقہ جسے تصوّف "مغزِدین"

بتاتا ہے’ عجمی تصوّر کی پیداوار اور انسانوں کے خود ساختہ “مذہب” کی ایجاد ہے۔ دین انفرادی زندگی نہیں بلکہ اجتماعی زندگی سکھانے کے لئے آیا تھا۔ لہٰذا’ دین کے نظام میں (جسے معاشرتی کہہ لیجئے یا معاشی) صحیح “روحانیت” کے بڑھنے کا راز پوشیدہ ہے۔ اسی نظام کی اہمیت کو اُجاگر کرنا میرا مقصود ہے۔ اس میں انسان کی موجودہ زندگی بھی شرفِ انسانیت کی حامل بن جاتی ہے اور موت کے بعد کی زندگی بھی۔

مختصر الفاظ میں پھر سن لیجئے کہ دین کے نظام سے مقصود کیا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے اور پھر ان کے ماحصل کو’ قرآنِ کریم کے پروگرام کے مطابق’ نوعِ انسان کی بہبود کے لئے صرف کرے۔ اس سے’ اس کی یہ دنیا بھی خوشگواریوں کی حامل ہوگی اور اس کے بعد کی دنیا (آخرت کی زندگی) بھی سرفرازیوں کی حامل۔ دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریاں اور سربلندیاں مومن کی زندگی کا مقصود ہیں۔ اس کے علاوہ’ قرآن کوئی اور “روحانیت” نہیں بتاتا۔ قرآنی نظام’ افرادِ معاشرہ کو طبعی زندگی کی ضروریات سے اس لئے بے فکر کر دیتا ہے کہ وہ انسانی مقاصد کے حصول کے لئے پوری پوری جدّوجہد کر سکیں’ یعنی وحی کی رُو سے عطا شدہ مستقل اقدار کو عام کرنے اور انہیں عملاً نافذ کرنے کے لئے فارغ ہو جائیں۔

سوال نمبر ۲:

آپ نے لکھا ہے کہ

i جو قوم اپنی کوششوں کو کائنات کے قانون سے ہم آہنگ کرتی ہے، اس کی کوششیں بار آور ہوتی ہیں اور

ii جو قوم صرف اپنے لئے نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے سوچتی ہے، اس کی آخرت بہتر ہو جاتی ہے۔

یورپ کی قومیں تسخیرِ فطرت بھی کر رہی ہیں اور اپنی آنے والی نسلوں کے غلبہ و تسلّط کی فکر بھی کرتی رہتی ہیں۔ تو کیا آپ یورپ کی اقوام کو بہترین مومن قرار دیتے ہیں؟

جواب:

جی نہیں! میں یورپ کی اقوام کو "مومن" قرار نہیں دیتا۔ اگر آپ میرے مضمون کے دوسرے مقامات کو بھی ساتھ ملا کر دیکھتے، تو اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔ میں نے اقوامِ یورپ کے متعلّق واضح طور پر لکھا ہے کہ:

> گروہِ اوّل وہ لوگ ہیں جو اپنے حال کی زندگی ہی کو زندگی سمجھتے ہیں اور آخرت کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنے حال کی زندگی کی کامیابیوں کیلئے تدابیر وضع کر رکھی ہیں اور وہ ان تدابیر پر عمل کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان سے انہیں پیش پا اُفتادہ مفاد حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس گروہ کو کفّار کا گروہ کہہ لیجئے جو مستقبل (آخرت) سے یکسر منکر ہے۔ آج اقوامِ مغرب اسی گروہ سے متعلّق ہیں۔ ان کے سامنے

> مستقبل ہے تو صرف اپنی قوم (نسل) کا۔ وہ نوعِ انسانی کے مستقبل کی کوئی فکر نہیں کرتے۔ ان کا وحدتِ انسانیت پر ایمان ہی نہیں۔ نیز وہ زندگی کو فقط طبعی زندگی مانتے ہیں، جس کا سلسلہ سانس بند ہو جانے سے منقطع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا، وہ زندگی کے مستقبل پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ مستقبل سے یہاں مراد مرنے کے بعد کی زندگی ہے۔

ان اقتباسات سے واضح ہے کہ میں یورپ کی اقوام کو مومن اور متّقی قرار نہیں دیتا، بلکہ ان کا شمار ان میں کرتا ہوں جو آخرت کے منکر ہیں۔ ایک تو ان کے پیشِ نظر نوعِ انسانی کا مشترکہ مفاد نہیں، بلکہ اپنی اپنی گروہ بندیوں کا مفاد ہے اور دوسرے وہ ظہورِ نتائجِ اعمال کے لئے حیات بعد الممات کے قائل نہیں جس کی وجہ سے انسان کی موجودہ زندگی کو وہ سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قرآن کا متوازن معاشی نظام قائم ہی نہیں کر سکتے جس کا ذکر اُوپر کیا جا چکا ہے۔ اس قسم کا نظام صرف وہ قوم قائم کر سکتی ہے جو زندگی کو طول اور عرض دونوں میں غیر منقطع تسلیم کرے، یعنی وہ وحدتِ انسانیت کی بھی قائل ہو اور حیات بعد الممات کی بھی اور اس کے ساتھ ہی تمام انسانوں کے لئے وحدتِ قانون کی بھی اور یہ تصوّر صرف قرآن دیتا ہے۔ یاد رکھئے کہ حیات بعد الممات محض ایک نظری عقیدہ نہیں کہ اسے مان لیا تو کیا اور نہ مانا تو کیا۔ یہ عملی زندگی کی ایک بنیاد ہے۔ اس عقیدہ کے انکار کے معنی یہ ہیں کہ انسان زندگی کو اسی دنیا کی

زندگی سمجھے۔ اس کے برعکس، اس اقرار کے یہ معنی ہیں کہ انسان اس حقیقت پر یقین رکھے کہ اس کی طبعی زندگی کے علاوہ، اس کی ذات بھی ہے۔ انسانی صلاحیتوں کی صحیح نشوونما سے اس کی ذات میں استحکام پیدا ہوتا ہے اور وہ اس قدر مستحکم ہو جاتی ہے کہ طبعی جسم کے منتشر ہو جانے سے بھی اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ آگے چلتی ہے اور مزید ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اس کا نام حیات بعد الممات ہے۔ دینِ اسلام کی بنیاد خدا کے دیئے ہوئے قوانین کی صداقت اور حیات بعد الممات کے واقعی اور حقیقی ہونے کے یقین پر استوار ہے۔

میں نے گذشتہ صفحات میں کہا ہے کہ جو شخص اپنی کوششوں کو خدا کے قوانین سے ہم آہنگ کرے گا، اس کی کوششیں نتیجہ خیز اور بارآور ہوں گی۔ پانی کے لئے قانونِ کائنات یہ ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ جو کسان اپنا کھیت پانی کے نشیب کی طرف بنائے گا، اس کا کھیت سیراب ہو گا۔ جو پانی کی سطح سے اُونچا بنائے گا، پانی از خود وہاں تک نہیں پہنچ سکے گا۔ فطرت کی قوتوں کو اپنے کام میں لانے کا یہی طریق ہے۔ جو قوم تسخیرِ فطرت کرے گی، اس کی کوششیں بارآور ہوں گی۔ اقوامِ مغرب اس نہج سے مسلمانوں سے آگے ہیں کہ وہ فطرت کے دبے ہوئے خزانوں کو کھود کھود کر باہر نکال رہی ہیں اور ان سے دھڑا دھڑ متمتّع ہو رہی ہیں۔ انہیں مفادِ عاجلہ (دنیاوی نعماء) نصیب ہیں، ہم ان سے محروم ہیں۔ صرف اس حد تک ان کی کوششیں کائناتی قانون سے ہم آہنگ ہیں۔ ہماری کوششیں اتنی بھی ہم آہنگ نہیں۔

جن اقوام کو مفادِ عاجلہ نصیب نہیں، زندگی اور اس کی حرارتوں میں ان کا کوئی حصّہ نہیں۔ ان کے متعلّق یہ سمجھنا فریبِ نفس ہے کہ اگر انہیں مفادِ عاجلہ نصیب نہیں تو نہ ہوں، ان کی آخرت خوشگوار ہوگی۔ یہ حالت موجودہ مسلمانوں کی ہے۔

جنہیں مفادِ عاجلہ میسّر ہیں، ان کے دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جو صرف مفادِ عاجلہ ہی کو مقصودِ زندگی سمجھتے ہیں اور انسانیت اور خود زندگی کے مستقبل (حیاتِ آخرت) سے انہیں کوئی تعلّق نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس غیر متوازن نظامِ زندگی کے قیام کے ذمّہ دار ہیں جس کی بساط آج ہر طرف بچھ رہی ہے۔ ان کا حال روشن ہے، لیکن مستقبل تاریک۔ لیکن اس کے باوجود یہ لوگ ان سے تو بہتر ہیں جن کا حال بھی تاریک ہے (یعنی جن کی قسمت میں "امروز" بھی نہیں ہے) اور مستقبل بھی تاریک ہوگا۔ اس اعتبار سے اقوامِ مغرب موجودہ مسلمانوں سے بہتر ہیں، کیونکہ ان کا (کم از کم) حال روشن ہے اور مسلمانوں کا حال اور مستقبل دونوں تاریک ہیں۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو مفادِ عاجلہ کے حصول کی جدّوجُہد کے ساتھ ساتھ انسانیت اور زندگی کے مستقبل (آخرت) پر بھی نگاہ رکھتا ہے۔ یہ وہ ہیں جن کا حال بھی درخشندہ ہے اور مستقبل بھی تابناک۔ یہ گروہ پہلے گروہ سے بہتر ہے جس کا صرف حال ہی روشن ہے۔ یہ ہے وہ گروہ جو اس قسم کے متوازن معاشی نظام کے قیام کا کفیل بنتا ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ نظام صرف اُسی گروہ کے ہاتھوں قیام پذیر ہو سکتا ہے جو وحدتِ انسانیت اور وحدتِ حیات پر ایمان رکھتا ہو۔ قرآن اس نظام کے قیام کا عملی طریقہ

بتاتا ہے' یعنی مفادِ عاجلہ کے لئے اپنی کوششوں کو قانونِ کائنات سے ہم آہنگ کرنا اور ان کوششوں کے ماحصل کو مستقل اقدار (وحی) سے ہم آہنگ کر کے ایسے ماحول کا قیام جس میں انسانیت بڑھے' پھولے اور پھلے۔ لہٰذا' اس نظام کا قیام قرآنی ضابطے کے بغیر ناممکن ہے۔ اس نظام کی حامل قوم کو جماعتِ مومنین کہا جائے گا اور یہی قوم دنیا کی امامت کی سزاوار ہوگی۔

مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ

۱۔ جو قوم تسخیرِ فطرت کرتی ہے اور زندگی' خدا کی بتائی ہوئی مستقل اقدار کے مطابق بسر کرتی ہے' اسے جماعتِ مومنین کہا جاتا ہے۔ ان کا حال بھی روشن ہوتا ہے اور مستقبل بھی تابناک' اس دنیا کی زندگی بھی خوشگواریوں اور سرفرازیوں کی زندگی اور آخرت بھی تابناک۔

۲۔ جو قوم تسخیرِ فطرت تو کرتی ہے لیکن زندگی' خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار کے مطابق بسر نہیں کرتی' اس کا حال (اس دنیا کی زندگی) خوشحالی میں گزرتا ہے لیکن آخرت کی زندگی میں ان کا کوئی حصّہ نہیں ہوتا۔ اقوامِ مغرب کا شمار انہی میں ہوتا ہے۔ انہیں صرف مقامِ آدمیت حاصل ہوتا ہے' مقامِ مومن نہیں۔

۳۔ جو قوم نہ تسخیرِ فطرت کرتی ہے نہ وحی کی مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے' ان کا نہ حال روشن ہوتا ہے نہ مستقبل تابندہ۔ ہمارا شمار انہی میں ہوتا ہے۔ یاد رکھئے! جو قوم تسخیرِ فطرت نہیں کرتی' اس کے لئے وحی کی مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا سوال

ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جسے مقامِ آدمیت بھی نصیب نہیں، اسے مقامِ مومن کس طرح نصیب ہو سکتا ہے

سوال نمبر ۳:

آپ نے لکھا ہے کہ اسلام ایک معاشی نظام قائم کرتا ہے۔ روس کی اشتراکیت کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ وہ ایک بہترین معاشی نظام قائم کرتی ہے۔ اس نے، ایک حد تک، اس نظام کو قائم کر کے بھی دکھا دیا ہے پھر اسلام اور اشتراکیت میں کیا فرق ہے؟

جواب نمبر ۳:

اول تو اشتراکیت کے معاشی نظام اور اسلام کے معاشی نظام میں بحیثیت نظام بڑا فرق ہے۔ اشتراکیت کے نظام کی بنیاد "مساواتِ شکم" پر ہے۔ اس کے برعکس اسلام کا نظامِ ربوبیت ایک ایسا متوازن ماحول پیدا کرتا ہے جس میں نہ صرف روٹی کا مسئلہ ہی حل ہو جاتا ہے بلکہ ہر انسان کی مضمر صلاحیتوں کے نشوونما پانے اور برومند ہونے کے پورے پورے اور یکساں مواقع بھی میسّر ہوتے ہیں۔ یعنی اس میں انسان کی معاشی ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ اس کی انفرادیت بھی قائم رہتی ہے۔ اشتراکیت میں انفرادیت یا انسانی ذات بُری طرح کچلی جاتی ہے۔ لیکن اصل فرق اُس اساس و بنیاد کا ہے جس پر اشتراکیت اور اسلام اپنے اپنے نظام کی عمارت استوار کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں اس سے پیشتر "(سلیم

کے نام دو خطوط میں) لکھ چکا ہوں، اشتراکیت کا تصوّرِ حیات یکسر مادی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی اشتراکی موت کے بعد تسلسلِ حیات کا قائل نہیں[1]۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا جذبۂ محرکہ ہے جس کی بنا پر اشتراکیین اپنا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ ان کے نزدیک زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے، اس لئے ان کے سامنے مفادِ عاجلہ کے سوا اور مفاد آ ہی نہیں سکتا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ نوعِ انسان سے ہمدردی کا جذبہ وہ قوت محرکہ ہے جس کی بناء پر وہ اس قسم کا عالمگیر نظامِ معیشت قائم کرنے کے لئے مصروفِ تگ و تاز ہیں، لیکن یہ جذبہ تو اخلاقی اقدار (Moral Values) کے ماتحت آتا ہے اور مادی نظریۂ حیات میں اخلاقی اقدار کا تصوّر بار ہی نہیں پا سکتا۔ یہ چیز بڑی دلچسپ ہے کہ ایک طرف تو کمیونزم کا میکانکی فلسفۂ زندگی، اخلاقی اقدار کو مٹانے کا داعی ہے لیکن دوسری طرف وہ اپنی تحریک کے قیام کے لئے دلیل اور جواز اخلاقی نظام سے مستعار مانگتا ہے۔ یاد رکھئے میکانکی تصوّرِ حیات کا ماننے والا کبھی اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ "میں اپنی محنت کے ماحصل کو دوسرے کی بہبود کے لئے کیوں صرف کروں"۔ اشتراکی نظام، مادی نظریۂ حیات کے ماتحت یا تو ہنگامی جذبات کے زور پر قائم کرایا جا سکتا ہے یا پھر "استبداد" سے۔ اس وقت عوام کو یورپین اقوام کے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جذبۂ انتقام کی بنا پر مشتعل کیا جاتا ہے اور یہی جذبہ کمیونسٹوں کے اس "جنون" کا ذمّہ دار ہے جو ان

---

[1] اشتراکیت اور اسلام کے معاشی نظام کا فرق سمجھنے کے لئے ان "خطوط" کا مطالعہ بہت مفید ہوگا، نیز میری کتاب "نظامِ ربوبیت" کا۔

کی مساعی میں اس قدر گرمجوشی پیدا کر رہا ہے۔ لیکن اس قسم کے منفی جذبات پر کسی تعمیری انقلاب کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ مشتعل گشتہ انتقامی جذبات فرو ہو جائیں گے' تو پھر اس نظام کے قیام کا کوئی سہارا باقی نہیں رہے گا[1]۔ اس وقت اس نظام کے ارباب حل و عقد' اپنی قیادت و سیادت' بلکہ اقوامِ عالم میں اپنی امامت کے تحفّظ اور بقا کی خاطر' اس نظام کے قیام کے لئے عوام سے اسی طرح کام لیں گے جس طرح ہر دوسرے نظام میں مستبد طبقہ نچلے طبقہ سے کام لیتا ہے۔ چنانچہ اب خود روس کے اربابِ حل وعقد اس کا اعلان کر رہے ہیں کہ سٹالن کا دور یکسر ظلم اور استبداد کا دور تھا۔ اس میں اسٹالن کا قصور نہیں تھا۔ یہ اس نظام کا فطری نتیجہ ہے جس کی بنیاد میکانکی نظریۂ حیات پر رکھی جائے۔

علاوہ بریں' اشتراکی نظام کی بنیاد انسانوں کے خود ساختہ اصولوں پر ہے اور یہ اصول نت نئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ ان اصولوں میں مارکس سے لے کر اسٹالن تک جو جو تبدیلیاں ہوئیں ہیں' وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں' اس لئے ایسے نظام پر بھروسہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔

اس کے برعکس' اسلام جس متوازن نظامِ ربوبیت کا قیام چاہتا ہے'

---

[1] آج دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ پرویزؒ صاحب کا یہ تجزیہ کس طرح حرف بہ حرف درست ثابت ہوا ہے اور کیمونزم کا معاشی نظام کس طرح یک لخت دنیا سے معدوم ہو کر رہ گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ و اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض بقا صرف اسی (نظامِ حیات) کو ہو گی جس کے سامنے تمام بنی نوعِ انسان کی منفعت ہو۔۔۔ (طلوع اسلام ٹرسٹ ۱۹۹۲ء)

وہ اس کی بنیاد وحدتِ انسانیت اور تسلسلِ حیات کے غیر متزلزل عقیدہ پر رکھتا ہے۔ توحیدِ خداوندی پر ایمان کا عملی مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں صرف ایک ہی قانون نافذالعمل ہے جو تمام نوعِ انسانی پر یکساں طور پر حاوی ہے اور جس کے اثر و نفوذ کا دائرہ طبیعی زندگی کے اختتام کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتا' بلکہ اس کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔ یہ قانون وحی کی رُو سے ملتا ہے (اور اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے)۔ دوسرے یہ کہ زندگی کی اساس (Base) ایک الوہیاتی توانائی (Divine Energy) ہے اور ہر فرد کو یکساں طور پر عطا ہوئی ہے۔ وہ اس عقیدے کی بنیادوں پر ایک عملی پروگرام کی عمارت اُٹھاتا ہے' جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس پروگرام میں شریک ہونے والے کی اپنی ذات میں ایک تغیّر رُونما ہو جاتا ہے۔ اس نفسیاتی تغیّر کا نام تعمیرِ سیرت یا استحکامِ ذات ہے۔ داخلی طور پر نفسِ انسانی میں یہ تغیّر رُونما ہوتا جاتا ہے اور خارجی دنیا میں وہ نظامِ ربوبیت وجود کوش ہوتا چلا جاتا ہے جس کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ اس طرح ایک دائرہ بن جاتا ہے جس سے انسان کی داخلی اور خارجی دونوں دنیاؤں میں ربوبیت کا سامان مہیا ہوتا جاتا ہے۔ ربوبیت (تربیت) کے معنی وہ طریقِ نشوونما ہے جس سے آہستہ آہستہ تدریجاً پانی کا قطرہ آغوشِ صدف میں گوہر بن جاتا ہے۔ اس استحکامِ ذات سے انسان حیاتِ جاوید حاصل کر لیتا ہے اور موت اس کی زندگی کا خاتمہ نہیں کر دیتی۔ اس نظام کی اطاعت اکراہاً اور استبداداً نہیں کرائی جاتی' بلکہ یہ خود نفسِ انسانی کی گہرائیوں سے پھوٹ کر نکلتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ یہ اطاعت اس نظامِ ربوبیت کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ جب

کھجور پک کر خودبخود شاخ سے الگ ہو کر نیچے ٹپک پڑے' تو اس کی یہ کیفیت اطاعت کہلاتی ہے۔ اس لئے اسلام کے نظامِ ربوبیت میں ہر "تربیت یافتہ نفس" (یعنی جس نفسِ انسانی کی نشوونما اس نظامِ ربوبیت کی رُو سے ہوگی) اس نظام کی اطاعت (بلکہ یوں کہئے کہ اس کے قیام و استحکام کے لئے جدّوجُہد میں شرکت) کا جذبہ اپنی ذات میں اُبلتا ہوا پائے گا۔ اسلام کے متوازن معاشی نظام سے مراد اس قسم کا نظامِ ربوبیت ہے نہ کہ محض روٹی کا حل اور ایسا حل جو مقصود بالذّات بن کر رہ جائے۔ یعنی جب روٹی کا مسئلہ حل ہو جائے تو اس کے بعد انسانی نشووارتقاء کے میدان بھی ختم ہو جائیں اور اس لئے اس کی سعی و عمل کے محرکات کے چشمے بھی سوکھ جائیں۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ فلسفۂ اشتراکیت اور اسلام کا نظامِ حیات' دو متضاد نظریات ہیں جن میں کسی صورت میں بھی مفاہمت نہیں ہو سکتی۔ اگر اشتراکیت کے معاشی نظام کے بعض اجزاء اسلام کے معاشی نظام کے بعض اجزاء سے ملتے ہیں' تو اس سے اشتراکیت اور اسلام ایک نہیں ہو جاتے۔ ان دونوں میں بُعدالمشرقین ہے' ایسا بُعد کہ نہ کوئی اشتراکی مسلمان ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی مسلمان اشتراکی ہو سکتا ہے۔ اسلام' نظامِ سرمایہ داری اور نظامِ اشتراکیت دونوں کیلئے چیلنج ہے۔

سوال نمبر۴:

آپ نے لکھا ہے کہ "مذہب" نے ملوکیت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہے (یا

ملوکیت نے "مذہب" کے ساتھ مفاہمت کر لی) کیا اس سے آپ کی یہ مراد ہے کہ بزرگانِ مذہب نے عمدًا اور دانستہ ملوکیت کو تقویت دینے کے لئے اس قسم کا سمجھوتہ کر لیا۔ پھر آپ نے لکھا ہے کہ اس سمجھوتے میں روایات، فقہ اور تصوّف نے ملوکیت کو بڑی مدد دی۔ کیا یہ چیزیں اسی مقصد کے لئے وجود میں لائی گئی تھیں؟

جواب نمبر۴

میں نے نہ تو ملوکیت کے ضمن میں کسی بادشاہ کا نام لیا ہے نہ مذہب کے سلسلہ میں کسی بزرگ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میرا مقصود افراد نہیں، بلکہ وہ نتیجہ ہے جس تک ہمیں تاریخ پہنچا رہی ہے۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے، اسلاف کے متعلق میرا وہی مسلک ہے جو قرآن نے ہر مسلمان کے لئے متعین فرمایا ہے اِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ (۵۹:۱۰) (وہ ہمارے بھائی ہیں جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے رخصت ہو گئے) ملوکیت اور مذہب دو (Institutions) ہیں اور میری تنقید ان انسٹی ٹیوشنز ہی سے متعلّق ہے نہ کہ افراد سے۔ باقی رہا یہ سوال کہ کس نے دانستہ کیا کچھ کیا اور نادانستہ کیا کچھ، سو اس کا فیصلہ خدا ہی کر سکتا ہے۔ ہم اس امر کے لئے جج بننے پر مکلّف نہیں۔ اس باب میں بھی میرا مسلک وہی ہے جسے قرآن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون سے مکالمہ کے ضمن میں فرمایا ہے کہ جب فرعون نے کہا کہ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی (اے موسیٰؑ یہ کہو کہ اسلاف کے متعلّق تمہارا کیا خیال ہے) تو انہوں نے جواب میں فرمایا عِلْمُهَا

عِندَ رَبِّیۡ فِیۡ کِتٰبٍ (۲۰:۵۲) (ان کا علم اللہ کے ہاں ان کے نامۂ اعمال میں ہے)۔ بزرگانِ کرام میں سے جس کسی نے دین کی خدمت کی ہے‘ ہم ان کے شکر گزار ہیں لیکن تاریخ کی حقیقت ہمارے سامنے ہے کہ جس نظامِ دینی کو **محمد رسول اللہ والذین معہ** (۴۸:۲۹) نے قائم کیا تھا‘ بعد میں وہ ثنویت میں تبدیل ہو گیا اور مذہب اور حکومت‘ انسانی زندگی کے دو مستقل دوائرِ عمل قرار پا گئے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ یہ کس طرح ہوا اور کن کے ہاتھوں سے‘ نہ ہی یہ کہ ایسا دانستہ ہوا یا نادانستہ۔ غلط کام دانستہ ہو یا نادانستہ‘ خارج میں اس کا نتیجہ ایک سا ہی مُرتّب ہوتا ہے۔ اگر کوئی ماں اپنے بچے کو دوائی کی جگہ نادانستہ زہر کی پڑیا دے دے‘ تو اس کا نتیجہ بھی اسی طرح موت ہوتا ہے جس طرح دانستہ زہر دے دینے کا نتیجہ۔ ہم آج اس زہر کو اس لئے تریاق نہیں کہہ سکتے کہ اسے نادانستہ دیا گیا تھا۔ جتنی جلدی اس زہر کو زہر کہہ دیا جاتا بہتر تھا‘ تاکہ آنے والے بچے اس سے ہلاک نہ ہوتے اور اگر اسے اس وقت زہر نہیں کہا گیا‘ تو کسی وقت تو اس کی ابتداء ہونی چاہیے۔ جب ہمارے پاس خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایک یقینی معیار موجود ہے جو زہر کو زہر اور تریاق کو تریاق بتا دیتا ہے‘ تو ہم اس پڑیا کو پرکھ کر کیوں نہ دیکھ لیں کہ زہر ہے یا تریاق۔

باقی رہا یہ کہ کیا روایات‘ فقہ وغیرہ اسی مقصد کے لئے وجود میں لائی گئی تھیں‘ سو ایسا نظر آتا ہے کہ جن لوگوں نے ان کی ابتداء کی تھی ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ لیکن ”عجم کی سازش“ نے ان چیزوں کو اپنے مقصد کے

لئے استعمال کیا اور ایسا کرنے کے لئے پہلے یہ کیا گیا کہ انہیں ان کے اصل مقام سے ہٹا کر ایک نئی حیثیت دے دی گئی۔ ان کی یہ نئی حیثیت اس خرابی کا اصل موجب ہے اور جب تک انہیں ان کی اصلی حیثیت نہیں دی جائے گی، یہ خرابی بدستور قائم رہے گی۔ دین کے غیر متبدّل اصول قرآن کے اندر ہیں۔ ان غیر متبدّل اصولوں کی جزئیات اُمّتِ محمدیہؐ نے اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے خود متعیّن کرنی تھیں۔ دین کی اصلی سند قرآن تھا، اس لئے اسے یقینی طور پر محفوظ رکھا گیا۔ باقی چیزیں وقتی طور پر نافذالعمل رہنے کے لئے تھیں، اس لئے انہیں محفوظ رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ عہد رسالتمآبؐ اور عہدِ صحابہ کرامؓ میں جب تک ان چیزوں کو یہی حیثیت دی جاتی رہی، ان سے نفع ہی نفع برآمد ہوا، خرابی کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ بعد میں آنے والوں نے عہدِ سابق کی روایات کو اس لئے اکٹھا کیا کہ ان سے اس عہدِ ہمایوں کی تاریخ مُرتّب کر لی جائے۔ یہ تھا جمع و تدوینِ روایات کا جذبۂ محرکہ اور یہ تھا ان روایات سے مقصود۔ لیکن جب بعد میں ملوکیت کو اپنے قیام کے لئے مقدّس سہاروں کی ضرورت پڑی، تو انہیں اس کی جستجو ہوئی کہ یہ سہارے کہاں سے مل سکتے ہیں۔ قرآن سے یہ سہارے مل نہیں سکتے تھے، اس لئے کہ قرآن کا ہر حرف اپنی اصلی شکل میں محفوظ تھا جس میں نہ کسی تبدیلی کی گنجائش تھی نہ اضافے کا امکان۔ اگر کوئی شخص **قال اللہ تعالیٰ** کہہ کر ایک لفظ بھی ایسا اپنی زبان پر لاتا جو قرآن میں نہیں تھا تو ہزاروں ہاتھ اس زبان کو پکڑنے کے لئے بیک وقت اُٹھ آتے۔ اس لئے کہ ہر شخص جانتا

تھا کہ یہ قرآن میں نہیں ہے' اس پر اضافہ کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا' ان سہاروں کے لئے کسی دوسری طرف رجوع کرنا پڑا۔ یہ گوشہ وہی ہو سکتا تھا جو قرآن کی طرح محفوظ نہیں تھا اور جس میں ہر قسم کے ردّو بدل اور تحریف و الحاق کی گنجائش تھی۔ یہ روایات کا مجموعہ تھا۔ جھوٹی روایات وضع کرنے میں کوئی مشکل نہ تھی۔ لیکن روایات کو اس عہد کی تاریخ قرار دینے سے ان کا مقصد پورا نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے ان روایات کو دینی قرار دے دیا گیا۔ بالکل قرآن جیسا دین (مثلہ' معہ) بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ کیونکہ روایات قرآن کی ناسخ بھی قرار دی گئیں اور اس پر قاضی بھی۔ جب روایات کی حیثیت' تاریخِ دین سے خود دین میں تبدیل کر دی گئی' تو پھر جس چیز کو چاہا' دین بنا دیا۔ روایات سازی کی صدہا کامیاب کوششوں کا ذکر کتبِ جرح و تعدیل میں موجود ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ کتنی کوششیں ایسی تھیں جنہیں احتساب کی نگاہیں پکڑ نہیں سکیں۔ ان دانستہ کوششوں کے علاوہ جو کچھ نادانستہ اور بڑی نیک نیتی سے ہوا' وہ بھی اپنی مقدار اور مضرّت رساں نتائج کے اعتبار سے کم نہیں تھا۔ ظنّیات کو جب بھی یقین کا درجہ دے دیا جائے' ایسا ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

جہاں تک عہدِ رسالتمآبؐ کی تاریخ کا تعلّق ہے' ہمارا ایمان ہے کہ اس میں کوئی بات قرآن کے خلاف نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے اُس دور کی تاریخ کے پرکھنے کا معیار بھی قرآنِ کریم ہی ہے۔ اس میں جو بات ایسی نظر پڑے جو قرآنِ کریم کے خلاف ہو' اس کے متعلّق ہمیں کہہ دینا چاہیے کہ وہ صحیح نہیں۔

جو کچھ روایات کے بارے میں ہوا وہی کچھ فقہ کے ساتھ ہوا۔ فقہ ان جزئیات کا نام تھا جو اربابِ تفقّہ نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے پیشِ نظر اپنے وقت میں، نافذالعمل ہونے کے لئے مدوّن کی تھیں۔ جب وہ زمانہ گزر گیا، تو ان جزئیات کی حیثیت بھی تاریخ کی رہ گئی، یعنی یہ بتانے کے لئے کہ کیا فلاں زمانے میں فلاں اصولوں کو یوں نافذ کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں ان فقہی جزئیات کو بھی غیر متبدّل قرار دے کر دین بنا دیا گیا۔ اس کے بعد جس طرح روایات میں جو جی میں آیا، اسے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب کر دیا گیا، اسی طرح فقہ کے متعلّق بھی جو مناسب سمجھا گیا، کسی امام فقہ کے نام سے مشہور کر دیا گیا۔ اس طرح یہ چیز بھی ملوکیت کی تقویت کا ذریعہ بن گئی۔

باقی رہا تصوّف، تو اس کا تصوّر اسلام میں ایک اختراع تھی۔ اگر تصوّف نام ہے اعمال میں اخلاص کا، تو اس کیلئے نہ کسی جداگانہ اصطلاح کی ضرورت تھی نہ کسی فن کی۔ اس لئے کہ وہ عمل جس میں اخلاص نہ ہو، منافقت کہلاتا ہے یا بے معنی رسم۔ عمل با اخلاص ہی ان نتائج کا حامل ہو سکتا ہے جو قرآن نے اعمالِ صالح کے پرکھنے کے لئے واضح الفاظ میں بیان کر دیئے ہیں تاکہ اس باب میں کسی کے لئے کسی غلط فہمی، دھوکا یا اشتباہ کی گنجائش نہ رہے۔ لیکن تصوّف نے اس ثنویت کو الوہیت کی سند عطا کر دی جو دین اور دنیا میں دوئی کا باعث بنی تھی اور جس سے ملوکیت نے اپنی زندگی پائی تھی۔ قرآن نے عیسائیت کے متعلّق کہا تھا کہ اس میں رہبانیت بطور ایک بدعت اختیار کی گئی تھی، لیکن وہ اس بدعت کو بھی نباہ نہ سکے،

اس لئے کہ انسانی جذبات کو دبانے کو کوششیں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ قرآن ان جذبات کو دوسری سمتوں کی طرف منتقل کر کے، انہیں مفید نتائج کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ رہبانیت انہیں دبانے کی کوشش کر کے انہیں مختلف زمین دوز راہوں سے نکلنے پر مجبور کرتی ہے۔ انسانوں کا خود ساختہ مذہب اسی قسم کے غیر فطری دباؤ کی زندگی سکھاتا ہے اور اس کا نتیجہ ہوتا ہے وہ (Perversion) جس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہماری کُتبِ روایات و فقہ میں اس قسم کے (Perversion) سے متعلّق جتنا لٹریچر ملتا ہے، وہ ان حضرات کا پیدا کردہ یا جمع کردہ ہے جنہوں نے روایات یا فقہ کی پہلے پہل جمع و تدوین کی۔ نہ معلوم اس لٹریچر میں کہاں کہاں کی چیزیں آکر شامل ہوگئیں اور کن راہوں سے یہ سانپ حریمِ کعبہ میں آ گھسے۔ لیکن جب ہم آج دیکھ رہے ہیں کہ کعبہ میں سانپ چھپا بیٹھا ہے، تو کیا ہم اسے محض اس لئے باہر نہ پھینکیں کہ یہ سانپ غلافِ کعبہ کے ساتھ لپٹا ہوا ہے؟ وقت ہے کہ ہم حریمِ کعبہ کو اس قسم کے بتوں سے پاک کر دیں۔ ان بتوں کی کعبہ میں باریابی نہ منشائے خداوندی تھا نہ مقصودِ رسالت، نہ بزرگانِ دین کے پیشِ نظر تھی نہ مجتہدینِ ملّت کا مدّعا۔ ہماری بدبختی سے انہوں نے کسی طرح وہاں تک راہ پالی۔ اب سوال یہ ہے کہ ان سانپوں کو کچل کر باہر پھینک دیا جائے یا اپنی عقیدت مندیوں کا دودھ پلا پلا کر ان کی پرورش کی جائے؟ ہمارے اربابِ شریعت کا ارشاد ہے کہ ان کی پرورش کی جائے کیونکہ ہمیں یہ سب کچھ اسلاف سے ملا ہے اور ہمارے اسلاف ہم سے بہتر سمجھتے تھے کہ غلط کیا ہے اور صحیح

کیا۔ میں یہ کہتا ہوں (اور میرا ایسا کہنا قرآن کی دلیل اور تائید کے ساتھ ہے) کہ ہمارے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود ہے‘ دین اس کے اندر ہے اور یہی غلط اور صحیح کا معیار ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیے کہ جو کچھ ہمارے پاس منتقل ہو کر آیا ہے‘ اسے قرآن کے معیار پر پرکھ لیا جائے‘ جسے وہ صحیح کہہ دے اسے رکھ لیا جائے‘ جسے وہ غلط کہہ دے اسے مسترد کر دیا جائے۔

میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہمارے زوال کا سبب انسانوں کا وہ خود ساختہ مسلک ہے جسے ”مذہب“ کہا جاتا ہے۔ جب تک ہم اس مسلک کو چھوڑ کر ہر چیز کو قرآن کی روشنی میں نہیں پرکھتے‘ (اسے دین کہتے ہیں) اس وقت تک ہمارے اُبھرنے کی کوئی صورت نہیں۔

پرویز

ایک خط
اور اس کا جواب

میرے جو خیالات سابقہ اوراق میں آپ کی نظروں سے گزرے ہیں، انہوں نے فضا میں خاصا تحرک پیدا کر دیا۔ اس حد تک کہ میرے ایک شفیق دوست نے، ان سے متأثر ہو کر، مجھے ذیل کا خط لکھا:۔

> پچھلے دنوں کئی آوازیں میرے کانوں میں آئیں کہ:۔
>
> پرویز صاحب کا یہ انداز خود پسندانہ ہے کہ گزشتہ صدیوں میں اسلام کی جتنی تعبیرات ہوئی ہیں، وہ از الف تا ی غلط ہیں اور سو فیصد صحیح تعبیر.... (Interpretation) وہ ہے جو میں کر رہا ہوں۔ ممکن ہے کسی خاص جملے سے یہ بات ظاہر نہ ہوتی ہو، لیکن پوری تحریرات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پچھلی صدیوں میں جہاں، جب اور جو کچھ ہوا، وہ سازشِ عجم ہی کا نتیجہ تھا۔"
>
> اگر یہ اعتراض جو آپ کی نگارش پر سننے میں آئے ہیں کسی حد تک صحیح ہوں، تو میری مخلصانہ رائے ہے

> کہ اس روش میں ایک حسین ترمیم یوں کر دی جائے کہ "پچھلوں نے جو کچھ بھی لکھا یا کیا ہے، وہ سب کا سب سازشِ عجم، اس لئے کُل کا کُل غلط نہیں، بلکہ ان کا بیشتر حصہ صحیح ہے۔ لیکن بات صرف اتنی ہے کہ وہ تعبیرات اپنے اپنے ادوار کیلئے اور اپنے اپنے عصری تقاضوں کے مطابق تھے۔ اب فلاں فلاں گوشوں کو جدید مقتضیات میں ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا، ان کی تعبیریں یوں ہونی چاہئیں اور یہ تعبیرات بھی دائمی نہ ہوں گی۔ جب نئے تقاضے سامنے آئیں گے، تو یہ بھی نیا لباس پہن لیں گی۔ میرا خیال ہے کہ یہ انداز زیادہ مؤثر اور جاذب اور حکمتِ تدریج کے مطابق ہوگا۔"

اس کے جواب میں مَیں نے یہ لکھا:

گزارش ہے کہ میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ پچھلی صدیوں میں جہاں، جب اور جو کچھ ہوا، وہ سازشِ عجم کا نتیجہ تھا اور جو تعبیرات میں پیش کر رہا ہوں، وہ سو فیصد صحیح اور دائمی ہیں۔

شق اوّل کے متعلق جو کچھ میں کہتا ہوں، وہ فقط اتنا ہے کہ میرے نزدیک **الدین منزل من الله** (خدا کی طرف سے نازل شدہ) ہے اور وہ قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ جو کچھ ہمیں آج دین کے نام سے بتایا جاتا ہے، اس میں جو بات قرآن کے خلاف ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔

اس کے جواب میں مجھ سے کہا جاتا ہے کہ جس چیز کو تم قرآن کے خلاف کہتے ہو، وہ فلاں روایت میں لکھی ہے اور فلاں بزرگ کی کتاب میں درج ہے۔

میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ میرے نزدیک نہ رسول اللہؐ کوئی بات (معاذ اللہ) قرآن کے خلاف فرما سکتے تھے اور نہ ہی میں ان بزرگوں کے متعلق ایسا گمان کر سکتا ہوں کہ انہوں نے قرآن کے خلاف کچھ پیش کیا ہو۔ لہٰذا، یہ چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آئمہ ملّت کی طرف غلط منسوب کر دی گئی ہیں اور یہی عجم کی سازش تھی۔ اگر اس پر بھی کسی کو اصرار ہے کہ نہیں!..... یہ باتیں رسول اللہؐ اور ائمہ کرام ہی کی ہیں، تو میں صرف اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ یہ جرأت آپ کو مبارک، میں تو اس کے تصوّر سے بھی کانپتا ہوں کہ کسی ایسی بات کو جو قرآن کے خلاف ہو (معاذ اللہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا حضورؐ کے کسی سچے متبع کی طرف منسوب کیا جائے۔

اب رہا یہ سوال کہ اس کا کیا معیار ہے کہ فلاں بات صحیح ہے اور فلاں غلط۔ سو اس کا جواب بالکل واضح ہے کہ اس کا معیار قرآن ہے۔

اگر آپ اس معیار پر متّفق ہو جاتے ہیں، تو پھر بات بہت سہل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر کچھ فرق ہوگا، قرآن کی تعبیر کا ہوگا، سند اور حجّت کا نہیں ہوگا۔ میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ میری تعبیر سو فیصد صحیح اور دائمی ہے۔ اس کے برعکس، میں شروع سے آج تک، مسلسل، متواتر کہتا چلا آرہا ہوں کہ آپ یہ نہ دیکھئے کہ میں کیا کہتا ہوں۔ آپ از خود، براہِ

راست قرآن پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ اصل دین کیا ہے۔ میری زندگی کا مقصد مسلمانوں کو براہِ راست قرآن تک پہنچانا ہے اور بس!

میں نے آج تک جو کچھ لکھا ہے‘ وہ قارئین کے سامنے ہے۔ میں ہر سوچنے والے کو ہمیشہ دعوت دیتا ہوں کہ وہ میری تحریر کو قرآن کے معیار پر پرکھے اور جہاں کوئی غلطی نظر آئے‘ اس سے مجھے مطلع کرے جس کے لئے میں اس کا شکر گزار ہوں گا۔ اس کے جواب میں معترضین کی طرف سے آج تک کبھی کسی نے یہ نہیں لکھا کہ تمہاری فلاں بات قرآن کے خلاف ہے۔ ہمیشہ یہ کہا ہے کہ تم حدیثوں کے منکر ہو اور اسلاف کے ناقد ہو‘ اس لئے مرتد ہو‘ کافر اور نہ جانے کیا کیا ہو۔؟

باقی رہا کسی تعبیر کا دائمی ہونا‘ سو اس کے متعلّق میں متعدّد بار لکھ چکا ہوں کہ ہم قرآن کو اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ آنے والے زمانے میں جب علمی سطح اور بلند ہو جائے گی‘ تو وہ لوگ قرآن فہمی میں ہم سے آگے بڑھ جائیں گے۔ اس لئے میں اپنی کسی تعبیر کو دائمی کس طرح کہہ سکتا ہوں؟ لیکن کسی تعبیر کا اصولِ قرآن کے خلاف ہونا اور بات ہے اور اس کا کسی ایک زمانے کی علمی سطح کے مطابق ہونا اور بات ہے۔ میں جس بات کی مخالفت کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ کوئی تعبیر اصولِ قرآن کے خلاف نہیں ہونی چاہیے۔

اب رہی میرے محترم کی ترمیم‘ سو اس کے دو حصّے ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآنِ کریم میں جن امور کا اصولی طور پر ذکر ہے‘ ان کے جزئی قوانین ہر دور کے تقاضوں کے مطابق مدوّن کئے جائیں گے۔ مثلاً ” قرآن میں زکوٰۃ

کا اصولی حکم ہے۔ اس کی جزئیات ہر دور کا قرآنی نظام خود متعیّن کرے گا۔

اس باب میں یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ان امور کی جزئیات اپنے اپنے دور کے لئے اور اپنے اپنے عصری تقاضوں کے مطابق تھیں۔ اس چیز کو میں اپنی تحریروں میں بار بار دُہرا چکا ہوں اور میرے نزدیک اسلامی نظام کی بنیاد ہی اسی اصول پر ہے۔

دوسرا حصّہ یہ ہے کہ کسی دور میں کوئی ایسا اصول وضع کر لیا جائے جو قرآن کے خلاف جاتا ہے، تو اس کے متعلّق یہ نہیں کہا جا سکے گا کہ وہ اصول اس دور کے لئے صحیح تھا اور اس لئے اب نئے سانچے میں ڈھالنا چاہیے۔ یہ قرآن پر اضافہ ہے جو میرے نزدیک قطعاً جائز نہیں مثلاً یہ عقیدہ کہ قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل کچھ اور بھی ہے (مثلہٗ معہٗ) اور یہ وہ مجموعہ روایات ہے جسے رسول اللہؐ کے دو اڑھائی سو سال کے بعد لوگوں نے انفرادی طور پر مرتّب کیا۔ یہ ایک اصولی عقیدہ ہے جو قرآن کے خلاف ہے، کیونکہ قرآن بے مثل و بے نظیر ہے۔ یہ عقیدہ نہ اپنے دور میں صحیح تھا نہ اسے آج ہی کسی اور سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ عقیدہ خالص عجم کی سازش کا نتیجہ ہے، کیونکہ اس سے بہت سی غیر قرآنی چیزوں کو عین اسلام بنانا بالکل آسان ہو جاتا تھا۔ دین اگر قرآن کے اندر محدود رہتا تو غیر قرآنی تصوّرات کو اسلام بنانے کی گنجائش ہی نہ رہتی۔ اس قسم کی خلافِ قرآن چیزوں کے متعلّق میں کہتا ہوں کہ یہ بلا تامّل و توقف ردّ کر دینے کے قابل ہیں، بلکہ یہ کہ جب تک انہیں ردّ نہ کیا جائے، حقیقی اسلام اُجاگر ہو کر سامنے نہیں آسکتا۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں، اس ضمن میں میرا مسلک۔ اس باب میں، میں نہ کسی حکمتِ تدریج کا قائل ہوں نہ اصول کو پسِ پشت ڈال کر انداز و اسلوب کو زیادہ مؤثر و جاذب بنانے کی مصلحت اندیشیوں کا حامی (حکمتِ تدریج کے اور مقام ہوتے ہیں)۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس قسم کی مصلحت کوشیوں کے ہاتھوں یہ دن دیکھنے نصیب ہوئے ہیں۔ اس لئے کوئی وقت تو ایسا آنا چاہیئے جب ہم بلا محابا یہ کہہ سکیں کہ یہ کچھ دین ہے اور یہ کچھ دین نہیں۔ میں مبداءِ فیض کی اس کرم گستری پر قدم قدم پر سپاس گذار ہوں کہ اس نے مجھے یہ توفیق عطا فرمائی ہے کہ میں قرآن کے معاملہ میں صاف صاف، بغیر لگی لپٹی، دو ٹوک بات کہہ سکوں اور اس پر بحضور ربّ العزت سجدہ ریز ہوں کہ ؎

ز برون درگذشتم ز درونِ خانہ گفتم
سخنے نہ گفتۂ را چہ قلندرانہ گفتم

فالحمد للہ علی ذلک

اضافہ

آخر میں، میں مختصر الفاظ میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ دین کا نظام قائم کس طرح ہوتا ہے۔ اس طرح کہ:

۱۔ ایک آزاد مملکت اس امر کا اعلان کرے کہ اس کا تمام کاروبار، قرآنِ کریم کے مطابق ہوگا۔

۲۔ قرآنِ کریم میں کچھ احکام و قوانین، متعیّن شکل میں دیئے گئے ہیں اور بعض اقدار، اصول کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔ قرآن کے احکام و قوانین ہوں یا اصول و اقدار، سب غیر متبدّل ہیں اور تمام مسلمانوں پر ہمیشہ کے نافذ العمل رہنے کے لئے دی گئی ہیں۔

۳۔ جن اقدار کے صرف اصول دیئے گئے ہیں، مملکت کے اربابِ فکرو نظر، نمائندگانِ ملّت، ان اصولوں کی روشنی میں، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، ان کے جزئی قوانین مرتّب کریں گے۔ ایسا کرنے میں وہ احادیث، تاریخ، فقہ کو اپنے سامنے رکھیں گے اور ان سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے، اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق، قوانین مرتّب کریں گے۔ جو کچھ پیچھے سے چلا آرہا ہے، اس میں جو قوانین ایسے ہوں گے

جو قرآنی اصولوں کے مطابق ہیں اور جو ہمارے زمانے کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں، انہیں ویسے ہی رہنے دیا جائے گا۔ جن میں تبدیلی کی ضرورت ہوگی، ان میں تبدیلی کر لی جائے گی۔ جہاں نئے قانون کی ضرورت ہو، نیا قانون بنا لیا جائے گا۔ اس طرح قرآن کے اصول غیر متبدّل رہیں گے اور ان کے اندر وضع کردہ قوانین، زمانے کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ، بدلتے جائیں گے۔ یوں مستقل اور قابل تغیّر و تبدّل عناصر کے حسین امتزاج سے، کاروانِ ملّت آگے بڑھتا چلا جائے گا۔

۴۔ دین کا مقصد، انسان کے اس دنیا کے معاملات کو اس طرح حل کرنا ہے کہ اس سے وہ فساد (ناہمواری) ختم ہو جائے جس کی وجہ سے افراد اور اقوام اس بری طرح جہنّم کے عذاب میں گرفتار ہیں اور اس کے ساتھ ہی افراد کی ذات کی نشو ونما اس طرح ہوتی جائے کہ وہ موت کے بعد کی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ اگر اس سے یہ نتائج مرتّب نہیں ہوتے، تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ اس میں کہیں خرابی ہے۔ اس خرابی (یا خرابیوں) کا سراغ ہمیں قرآنِ کریم کی روشنی میں مل سکتا ہے۔ میری حقیر کوششوں سے مقصود یہ ہے کہ ہم ان خرابیوں کا ازالہ کر کے دین کے نظام کو انہی خطوط پر متشکل کر سکیں جن پر یہ حضور رسالت مآبؐ کے عہدِ

مبارک میں استوار ہوا تھا۔

اس کے ساتھ اتنا اور سمجھ لینا چاہیے کہ جب تک وہ نظام قائم نہ ہو، (جسے خلاف علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے) اس وقت تک اُمّت جس جس طریق سے اسلام کے ارکان کو ادا کرتی چلی آرہی ہے، اس میں نہ کوئی تبدیلی کی جائے اور نہ ہی کوئی نیا طریقہ وضع کیا جائے۔ اس سے خواہ مخواہ مزید اختلاف اور انتشار پیدا ہوگا۔ البتّہ جو نظریات و تصوّرات یا رسوم اور رواج قرآن کے خلاف رائج ہیں، ان کی بابت یہ بتایا جائے کہ یہ قرآن کے خلاف رائج ہیں اور قرآنی نظام کی صحیح شکل کو اُجاگر کرکے اُمّت کو اس طرف آنے کی دعوت دی جائے۔ جب وہ نظام قائم ہو جائے گا، تو یہ اس کا فریضہ ہوگا کہ دیکھے اور فیصلہ کرے کہ مسلمانوں کے موجودہ اختلافات کو مٹا کر ان میں پھر سے وہ وحدتِ فکروعمل کیسے پیدا کی جائے جو عہدِ رسالتمآبؐ میں وجۂ بالیدگیٔ مِلّت تھی۔ میری کوشش بس اتنی ہے۔

والسلام

پرویز

* * *